

امتحانی مشق نمبر 2

(یونٹ نمبر: 6 تا 9)

کل نمبر: 100

کامیابی کے نمبر: 40

- سوال نمبر 1- معروف متکلمین: واصل بن عطاء، ابوعلی الجبائی اور نظام کے احوال اور کلامی افکار پر بحث کیجئے۔ (20)
- سوال نمبر 2- بحثِ انبیاء کی ضرورت و اہمیت اور اہداف و مقاصد پر سیر حاصل بحث کیجئے۔ (20)
- سوال نمبر 3- حیات بعد موت کے عقلی دلائل پیش کیجئے۔ (20)
- سوال نمبر 4- وجود باری تعالیٰ اور تخلیق کائنات پر جدید سائنسی نظریات کی روشنی میں مدلل بحث کیجئے۔ (20)
- سوال نمبر 5- جبر و قدر کے بارے میں مختلف کلامی فرقوں کے نظریات کا تجزیہ کیجئے۔ (20)

ANS 01

وہ ایک ایسا شخص ہے جو مدینہ منورہ میں پیدا ہوا تھا اور وہاں اپنے وقت کے علوم کا مطالعہ کیا، پھر وہ وہاں بصرہ چلا گیا، وہاں کے علماء اور جدید ماہرین سے رابطہ کیا، اور اس وقت الاجراء کے پیروکاروں میں سے ایک خوار جائی (نفیح) بن الاذراق نے ان کی بغاوت کو تیز کر دیا تھا اور ان کی رائے میں اور گناہوں کے تعین کے بارے میں اپنی تحقیق میں مبالغہ آرائی کی تھی۔

مدینہ میں پیدا ہوئے اور بصرہ میں رہائش پذیر ایک جدید اسکالر الحسن البصری کی ایک کونسل تھی جو لوگ مسجد میں تشریف لاتے تھے، اور انہوں نے روایت کیا کہ واصل بن عطاء اور عمرو بن عبید اس وقت داخل ہوئے جب وہ درس دے رہے تھے۔ واصل نے اس سے پوچھا: "اے مذہب کے امام، لوگوں کا ایک گروہ جو بڑے گناہوں کے مالکان کا انکار کرتا ہے، ہمارے زمانے میں نمودار ہوا ہے... اور ایک گروہ جو گناہ کرنے والوں کو پسپا کرتا ہے۔ لہذا آپ ہمارے لئے اس کا انصاف کیسے کر سکتے ہیں؟

الحسن نے سوچا، اور جواب دینے سے پہلے، واصل بن عطاء نے کہا: میں یہ نہیں کہتا کہ بڑے کا مالک مطلق مومن ہے اور نہ ہی کافر، بلکہ وہ دونوں صفوں کے مابین اس حیثیت میں ہے، نہ مومن اور نہ ہی کافر، پھر وہ اٹھ کر مسجد کے ریکارڈ میں سے ایک پر گیا۔ الحسن نے کہا: وہ ہم سے روانہ ہوا اور چلتا رہا، اس لئے اس نے اور اس کے ساتھیوں نے متوضی کو فون کیا۔

اس طرح، معتجاج فرقہ سلف گروپ یا اہل سنت کے ساتھ ساتھ خارجیوں اور ان کے مختلف گروہوں کے سامنے قائم ہوا تھا، اور نافع بن الاذراق کے پیروکار اس کا حوالہ دیتے ہیں، اور بیت المقدس سے جوہانی نے اتحاد کیا جس نے کہا کہ انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے کیونکہ وہ ایسا کرنے کے قابل ہے، اور اس نے الحکم بن صفوان سے بھی اتحاد

کیا جنہوں نے خدا کی صفات سے انکار کیا ان کے گروہ نے اس سے بڑا مسئلہ نہیں اٹھایا۔ صرف اہل سنت سے ان کے اختلاف اور اختلاف کی بات کے طور پر، لیکن ان کے ساتھ اتحاد کرنے والوں کے نظریات اس میں شامل ہو گئے۔

واصل بن عطاء نے توحید کے بارے میں اپنے نظریات کو ان کے عقیدے سے مطمئن کرنے کے لئے مطیعانی گروپ کے قیام کی کوشش کی، اور کہا گیا کہ واصل بن عطاء کے کردار، فصاحت اور اپنی منطق میں ایک بیان میں طاقت اور یکجہتی ہے، اگرچہ اس نے رائیں چاٹ لیا، اور پھر بھی اس کے بارے میں انہوں نے کہا: اس نے ایک لمبا خطبہ ترتیب دیا جو پہلے تھا یہ سب R کے خط سے ہے، تاکہ اس کا عیب ظاہر نہ کرے۔

اور ان نظریات کو پھیلانے کا ایک ذریعہ ان بحث و مباحث کی بڑی تعداد تھی جو وہ اور ان کے پیروکار ان کی دعوت کو قبول کرنے کے لئے، اور غضب اور دوسرے فرقوں کے لوگوں سے بحث و مباحث کو جنم دیتے تھے، جیسا کہ اس نے لکھا تھا۔ ان خیالات کے بارے میں اپنے وقت کے مختلف فنون لطیفہ میں متعدد کتابیں، کتاب بھی شامل ہیں (ماؤنزم کے جواب میں دیف سوال)۔

اور کتاب (مرجع کی اقسام) اور کتاب (توبہ) اور تحریر (قرآن کے معانی)، کتاب (علمائے دین اور جہالت کے طبقات) اور کتاب (دو گھروں کے مابین کی حیثیت))، کتاب (ایک اور دائیں خطبات)، کتاب (حقیقت جاننے کا راستہ) اور کتاب (اس کے اور عمرو بن عبید کے مابین کیا ہوا)، کتاب (اذان)، کتاب (فتویٰ)، کچھ اشعار کے علاوہ جعفر الصادق کے نکاح اور جوابات کے کچھ خطبات۔

اور چونکہ وہ ایک نظریہ کا بانی اور ایک فرقے کا بنانے والا تھا، اس کی قیادت کی خصوصیات کے ساتھ، اس کی فکر کو اپنے نظریے کے ثبوت کے ساتھ پیش کرنا پڑتا تھا، اور وہ عقیدہ منطق کے ساتھ اس نظریے کو غیر مسلموں کے ساتھ پکارتا تھا، اور انہوں نے قرآن کے توسط سے اہل اسلام کے ساتھ اپنے نظریے کی تاکید کی، اور ان کا خیال تھا کہ علم اور حق تک رسائی کا راستہ صرف خدا کی کتاب ہی ہے!۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ واصل بن عطاء اس نقطہ نظر تک پہنچ چکے ہیں جو وہ اپنے نظریے کی تشکیل میں لیتے ہوئے ہر نظریے کے ثبوت اور ثبوت کے طور پر لے سکتا ہے۔ اس طرح، جسے اسلامیات کی سائنس یا فلسفہ اسلام کہا جاتا تھا، اسلام میں جانا جاتا تھا، کیونکہ یہ ان فلسفیانہ ڈھانچے اور فلسفیانہ تصورات کی طرح تھا جو اسلام سے پہلے مرتب کیے گئے تھے، چاہے وہ یونانی، رومن یا فارسی ہوں۔

اور جیسا کہ لوگوں نے انصاف اور توحید کے لوگوں کو متواتر اسپیکر کے ابتدائی شور و یروں میں کر سٹل اسٹالائز کیا تھا۔ یہ اس امت کا فلسفہ تھا، جس نے عقل کو مذہبی عقائد کی تعریف کرنے اور ان کے بارے میں شکوک و شبہات کو دور کرنے کا راستہ اختیار کیا، اور یہ بہن کس کے درمیان ہے کتاب اور عقل، جیسا کہ وہ خالق کی رہنمائی کرتے ہیں،

اسی کی شان ہے، جس نے انہیں انسان کی رہنمائی کے لئے پیدا کیا ہے۔ جیسا کہ الجاہیز کہتے ہیں، انہوں نے ایسا نہیں کیا جو فلسفیوں نے کیا، جس نے بغیر دماغ پر سکون حاصل کیا منتقل کرنا۔

نیز، انکشافات اور روایات کے مطابق مذہب اور اس کے اعتقادات کے معاملات میں کھڑے ہو کر متنازعہ اس سے مطمئن نہیں تھے بلکہ انہوں نے "وجہ" اور "ٹرانسمیشن" کو ملایا اور پھر ذہن کو ایک حکمران بنادیا جس کے ساتھ نصوص پیش کیے گئے، تاکہ ایسا ہوتا ہے۔ بعض اوقات۔ ان کے مظاہر اور ذہنوں کے ثبوتوں کے مابین تضاد ہوتا ہے۔... اور معتزلی بولنے والوں میں سے ایک حج عبد الجابر ابن احمد الحمدانی کا کہنا ہے کہ:

"قانونی ثبوت صرف تین نہیں ہیں: یہ قرآن، سنت اور اجماع ہے، لیکن یہ چار ہے، اور عقل ان میں سے ایک ہے۔ بلکہ، یہ پہلا ہے اور حکمران ان میں سے ایک ہے۔ سنت اور اتفاق رائے۔" اور وہ آگے بھی کہتے ہیں: "ان میں سے کچھ لوگ اس انتظام پر حیرت زدہ ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس کا ثبوت یہ ہے: کتاب، سنت، اور اجماع صرف۔

یا اس کا خیال ہے کہ اگر ذہن معاملات کی نشاندہی کر رہا ہے تو یہ ایک رکاوٹ ہے، اور یہ معاملہ نہیں ہے، کیوں کہ خدا تعالیٰ نے کسی اور کو نہیں بلکہ عوام الناس کو مخاطب نہیں کیا، اور اس کی وجہ سے وہ جانتا ہے کہ کتاب ایک دلیل ہے، جیسا کہ سنت اور اجماع ہے، لہذا اس باب میں وہی اصول ہے۔ ..

ڈاکٹر عمارہ یہ کہتے ہوئے تبصرے کرتے ہیں: (اور اگر مثنیٰ طبقات اسلام کے عقائد کی تعریف کرنے میں ناکام رہے ہیں تو، اس طرح کہ پچھلے مذاہب کے "مذہبی ماہرین" کے ارد گرد مخالفین نے ان سے دفاع کیا ہے، کیونکہ ان کا سامان صرف نصوص تھا اور ایسی روایات جنہیں مخالفین جائز نہیں مانتے، تب اسلام بولنے والوں کا نقطہ نظر ان مخالفین کا مقابلہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

در حقیقت، وہ ان کے ساتھ بحث کرنے میں مہارت رکھتا تھا، کیوں کہ معاضی نے عقلیت پسندی کو بطور ہتھیار استعمال کرنے میں سبقت حاصل کر لی تھی جس سے وہ الہیات کے ان اداروں میں غالب آچکے تھے۔ جبکہ عیسائی مذہبی ماہرین روایات کو ایمان کا واحد راستہ بناتے تھے، اور پھر ان کو سمجھنے اور ان کی تائید کرنے کے لئے استدلال کا استعمال کریں، اسلام کے متلاشی اس مقام پر گئے جہاں انہوں نے عقیدہ حاصل کرنے کے لئے راہ بنالیا، یہ نصوص اور روایات سے پہلے اور اس سے ماوراء ہے۔

اور جب ہم ذہن کے ساتھ ایک معبود جانتے ہیں جو الہی کے ذریعہ تنہا ہے اور ہم اسے عقلمند جانتے ہیں تو ہم ان کی کتاب سے جانتے ہیں کہ اس کی ایک اہمیت ہے، اور جب ہم اسے رسول کے قاصد کی حیثیت سے جانتے ہیں اور اس سے تمیز کرتے ہیں۔ جھوٹے لوگوں سے معلومات اور معجزات، ہم جانتے ہیں کہ رسول کا قول ایک دلیل ہے۔ اجماع ایک دلیل ہے۔ دماغ سب سے پہلے ہے اور فیصلہ ہے۔ یہ وہی حال ہے جب عیسائی الہیات، جملے یروشلیم کے مطابق، اسلام نے اپنایا تھا۔

1109 AD - 1033 آرک بشپ آف کنٹری، بیری کا ماننا ہے کہ: "اسے پہلے دیکھے بغیر، آپ کے دل کے سامنے پیش کی گئی باتوں پر یقین کرنا چاہئے، پھر آپ کی سوچ کو سمجھنے کے لئے اس کی جدوجہد کرنی چاہئے، کیوں کہ ایمان کو وجہ سے غور کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔!.."

لہذا، اسلام کے عقلیت پسند اسپیکر اس کے اعتقادات کے بارے میں نہ صرف اسلام کے مخالفین کے حملوں کو پسپا کرنے میں کامیاب ہوئے، نہ صرف مذہبی اداروں نے نئے مذہب پر پائے جانے والے شکوک و شبہات کا مقابلہ کرنے میں، بلکہ وہ ان کے نظریہ پر حملہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اداروں نے، لہذا انھوں نے کھلے ممالک اور فکری ورثے کے حامل لوگوں میں اسلام کو عام کیا۔ عقلیت، اس وقت تک کہ جب وہ اس میں اقلیت رہے اس کے بعد وہ ریاست کی اکثریت میں اکثریت نہیں بن گئے۔

کچھ لوگوں نے یہ بھی مانا ہو گا کہ متوضی اسکول کا بانی علوم، خاص طور پر ٹرانسمیشن سے عاری تھا، لیکن یہ عقیدہ بالکل بھی درست نہیں ہے۔

اور اگر مورخین حدیث نے اس کو مسترد کرنے اور اس کے باوجود سائنس کے حدیث میں واسعل کے ذکر کو نظر انداز کیا تو پہلے سنیوں کی پوزیشن کے مطابق، پھر اس کے گروپ کی کتابیں سنت میں اس کی دلچسپی کا تذکرہ کرتی ہیں جیسا کہ اس کے پاس تھا۔ خبر میں جرد bold ت مند انہ رائے، اور اس کی تفریق کو قبول کرنے کے ضوابط، اور اس نے دیکھا کہ سچائی کو چار طریقوں سے جانا جاتا ہے: ایک کتاب جو (قرآن) بولتی ہے، اور اس پر ایک سنجیدہ رپورٹ (سنت)، دلیل امت کا ذہن، اور اتفاق رائے۔

انہوں نے حدیث کی تفسیر کے بارے میں اپنے موقف کی وضاحت کی ہے، یہ ہے کہ یہ اس پر ایک اجتماعی رپورٹ ہے، یعنی یہ اکثر احادیث کے کنونشن کے مطابق ہوتی ہے، اور وہ اتوار کی احادیث کو مسترد کرتا ہے، جیسا کہ اس نے اس کی پیروی کی۔ اس کے بعد اس معاذلہ میں۔

فقہ میں اپنے مقام کے لحاظ سے، اس نے اسے حاصل کرنے میں عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کیا، اور وہ فتاویٰ اور فقہائے لطیفے کے سب سے زیادہ علمبردار افراد میں سے ایک بن گیا، اور فقہاء اور پیروکاروں کی رائے اور فتوؤں میں ان کے اختلافات کو بیان کرتے ہوئے، اور اس کے پیچھے سے اس کی تلاش کی۔ لوگوں کو اس نظریاتی تصورات سے واقف کرنے کے لئے جس تک وہ پہنچے، اور ان کو الگ تھلگ اصولوں سے آگاہ کرنا جو اس نے منظور کیا تھا، اور وہ کہتے تھے: "اگر میں فتوؤں کے بارے میں لوگوں کے فرق کا ذکر

کر کے لوگوں کو مذہب کے بارے میں جاننے کے لئے فون نہیں کرتا تھا تو، میں اس کے ایک خط کی طرف نہیں دیکھا ہوتا، لیکن مجھے امید ہے کہ انھیں علم تک پہنچایا جائے گا۔

اصولی الفقہ میں، اس کی اہم شراکت ہے، جیسا کہ یہ ذکر کیا گیا تھا کہ منسوخی قانونی فیصلے کے تمام حص cover وں کا احاطہ نہیں کرتی ہے، بلکہ اس میں صرف دو حصوں یعنی

کمانڈ اور حرمت کا معاملہ ہے، اور اس کی بنا پر کارآمد تقسیم ہونے پر تقریر کو کمانڈ، حرام اور خبر کی حیثیت سے، اور اس تقسیم نے مخاطب کی صورت حال کو مد نظر رکھا، جیسا کہ

انہوں نے کہا کہ اس کی نقل کرنا جائز نہیں ہے، حقیقت میں، خدائی ذات کا جھوٹ بیان کرنے سے انکار ہے۔

ج۔ دونوں پوزیشنوں کے مابین کی حیثیت، اور ہم پہلے بھی اس مسئلے پر ان کا موقف پیش کر چکے ہیں، جو ان اہل سنت گروپ سے علیحدگی کی بنیاد ہے۔

ب۔ توحید: یہ ان کے لئے دوسرا اصول ہے، اور اس کے معنی ہیں کہ خدا حادثات کی مماثلت سے بالاتر ہے، اور یہ حیرت کی بات ہے کہ وہ علم، قابلیت اور ارادیت کی

خصوصیات کو نظر انداز کرتے ہیں اور اس سے ان کا مقصد طے کرنا تھا دو قدیم خداؤں کے وجود کی ناممکنات: خود اور صفات۔

اور یہ کہ جس نے بھی کسی قدیم صفت کے معنی کو ثابت کیا وہ دو معبودوں کے بارے میں کہا تھا، اور اس نے اس میں ان صفات کی تردید کی تھی اس خوف سے کہ مسلمان عیسائیوں میں آکر ختم ہو جائیں گے، جو تین خود الہی صفات میں فرق کرتے ہیں۔ وجود، علم، اور زندگی، اور ہر ایک اوصاف کو خود سے آزاد بنادیا، اور اسے افراد کہا۔

A - انصاف: واصل کو بدنامی اور انتخاب، انسانی اعمال اور خدا کے اعمال کے معاملے میں مشغول کیا گیا تھا، اور وہ اس شخص کو عمل کا نشانہ بننے کے لئے پاس نہیں کر سکتا تھا اور پھر اس کے لئے جوابدہ نہیں رہ سکتا تھا۔ زبانی، اور اسی اصل کی وجہ سے، وہ مسلمانوں میں انسانی آزادی کے علمبردار کہلائے گئے تھے۔

ابو علی الجبائی

حضرت عثمان بن عفان کے غلام ابو علی محمد بن عبد الوہاب بن سلام بن خالد بن جبران بن ابان، خدا اس پر راضی ہوں، جو مطیع کے اماموں میں سے ایک الحب الہی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ وہ علم الہیات میں ایک امام تھے، اور انہوں نے یہ علم اپنے وقت میں بصرہ میں مطیع کے سربراہ ابو یوسف یعقوب بن عبد اللہ الشہام البصری کے اختیار پر لیا تھا، اور ان کے مشہور مضامین تھے۔ عقیدہ فخر، اور اسی کی طرف سے سنت کے شیخ، شیخ ابو الحسن ال اشعری نے الہیات کا علم لیا، اور ان سے اس سے بحث ہوئی کہ علمائے کرام نے بیان کیا، کہا جاتا ہے کہ ابا الحسن مذکورہ شخص نے اپنے استاد ابو علی الجببی سے تین بھائیوں کے بارے میں پوچھا: ان میں سے ایک راستبازی کا ماننے والا تھا، دوسرا کافر، زانی اور بد بخت تھا، اور تیسرا جوان تھا، لہذا وہ فوت ہو گئے، تو ان کی حالت کیسے ہے؟ الجبائی نے کہا: سنیا سیوں کی بات تو یہ ہے کہ یہ ڈگریوں میں ہے، اور کافروں کے بارے میں، یہ تاریک حلقوں میں ہے، اور وہ نوجوان جو صلح پسند ہے، اشعاری نے کہا: اگر ایک نوجوان شخص ایک سنسنی خیز کی صف میں جانا چاہتا ہے، کیا اسے اس کی اجازت دی جاسکتی ہے؟ الجببی نے کہا: نہیں، کیوں کہ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ: آپ کا بھائی اس کی بہت زیادہ اطاعت کی وجہ سے صرف اس درجے پر پہنچا ہے، اور آپ کی اطاعت نہیں ہے، لہذا اشعری نے کہا: اگر اس نوجوان نے کہا: کوتاہیاں مجھ سے نہیں ہیں، کیونکہ آپ نے مجھے نہیں رکھا اور مجھے اطاعت کرنے کا اہل نہیں کیا، لہذا الجببی نے کہا: الباری، عظیم اور اعلیٰ، فرماتا ہے: میں جانتا تھا کہ اگر آپ باقی رہ جاتے تو میں نافرمانی کرتا اور دردناک عذاب کے لائق ہو گیا، لہذا میں آپ کی دلچسپی پر غور کروں گا، چنانچہ اشعری نے کہا: اگر کافر بھائی نے کہا: اے جہان کے خدا، جیسا کہ آپ کو اس کا حال معلوم تھا، تو میں اب جانتا تھا، آپ نے اس میں کیوں لیا؟ میرے بغیر اس کی دلچسپی کا محاسبہ کریں؟ الجببی نے العاشری سے کہا: تم پاگل ہو، تو اس نے کہا: نہیں، لیکن شیخ کا گدھا عاقبہ میں کھڑا ہوا، لہذا الجببی کاٹ دیا گیا۔

پھر مجھے عظیم القرآن کی تفسیر میں یہ معلوم ہوا کہ سورت الانعام میں شیخ فخر الدین الرازی کی درجہ بندی: کہ جب اشعری پروفیسر الجببی کی کونسل سے روانہ ہوئے اور اپنے عہدے سے رخصت ہوئے عقیدہ تھا، اور وہ اکثر ان کے اقوال پر اعتراض کرتا تھا، ان کے مابین ظلم و بربریت زیادہ تھی، لہذا ایک دن اس بات پر اتفاق ہوا کہ الجببی نے یادگاری کونسل منعقد کی تھی، اور لوگوں کے ایک عالم نے اس کے ساتھ شرکت کی، لہذا اشعری اس طرف گیا مجلس، اور وہ کچھ معاملات میں بیٹھ کر، الجبائی سے روپوش ہوئے، اور اس نے اس میں شریک کچھ خواتین سے کہا: میں آپ کو ایک مسئلہ سکھاتا ہوں، تو اس شیخ کی یاد دلائیں، پھر اس نے ایک سوال کے بعد اسے ایک سوال سکھایا۔

اور میں نے خوزستان کے باب میں ابن حوقل کی کتاب اور راستوں کی بادشاہی میں دیکھا کہ ایک شہر اور ایک وسیع رستق نے کھجور کے درخت، گنے اور دیگر عمارتوں کو الجھا دیا۔ انہوں نے کہا: ابو علی الجببی، معتزلہ کے عظیم شیخ، اور اپنے وقت کے چیف اسپیکر سمیت۔

ANS 02

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو زمین میں آباد کرتے وقت ان کی ضرورت کی تمام چیزیں فراہم کر دیں اور کائنات کی تمام قوتوں کو ان کی خدمت میں لگا دیا۔ ان کے اعضا و جوارح ان کی بنیادی ضروریات کی تکمیل میں لگے ہوئے ہیں اور نباتات و حیوانات ان کی غذائی اور دوسری ضرورتوں کی تکمیل میں۔ چاند، سورج، ستارے، پہاڑ، دریا اور دوسرے مظاہر نظام کائنات میں توازن قائم کیے ہوئے ہیں۔ ہوا، پانی، روشنی وغیرہ سے ان کی زندگی کا تسلسل قائم ہے۔ ان مادی ضروریات کے ساتھ اللہ تعالیٰ ان کی روحانی ضرورت کی تکمیل سے غافل نہیں رہا ہے۔ اس نے ابتدا ہی سے اس کا بھی انتظام کر رکھا ہے کہ انسانوں کو معلوم ہو کہ انہیں کیوں پیدا کیا گیا ہے؟ انہیں پیدا کرنے والا کون ہے اور وہ ان سے کیا چاہتا ہے؟ دنیا میں انہیں کس طرح زندگی بسر کرنی ہے؟ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے؟

قُلْنَا انْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا فَاَنۡبَايَا نَّيۡتُكُمۡ مِّنۡنۡيۡ هُدًى فَمَنۡ تَبِعَ هَدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیۡہِمْ وَلَا ہُمۡ یَحْزَنُوۡنَ ۝ وَالَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَکَذَّبُوۡا بِآیَاتِنَا اُولٰٓئِکَ اَصْحَابُ النَّارِ ہُمۡ

فِیۡہَا خَالِدُوۡنَ ۝ (البقرہ: ۳۸-۳۹)

”اور ہم نے کہا کہ تم سب یہاں سے اتر جاؤ۔ پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمہارے پاس پہنچے تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی

کریں گے، ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا اور جو اس کو قبول کرنے سے انکار کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے وہ آگ

میں جانے والے ہیں، جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔“

انسانوں کی ہدایت کے لیے انبیاء کی بعثت

ابتداء میں تمام انسان راہِ راست پر قائم تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں زندگی گزارنے کا جو طریقہ بتایا تھا اس پر وہ عمل پیرا تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ ان میں انحراف آنے لگا، نفسانی

خواہشیں سراٹھانے لگیں اور وہ سیدھے راستے سے ادھر ادھر بھٹکنے لگے۔ اس وقت ان کے درمیان اتحاد و اتفاق باقی نہ رہ سکا۔ کچھ لوگ سیدھی رام پر قائم رہے اور کچھ لوگ

غلط راہوں پر جا پڑے۔ اس حقیقت کو قرآن مجید نے یوں بیان کیا ہے:

وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّا اُمَّةٌ وَّاحِدَةٌ فَاُخْتَلَفُوۡا ﴿۱۹﴾ یونس: ۱۹

”ابتداءً سارے انسان ایک ہی امت تھے، پھر انہوں نے اختلاف کیا۔“

اس آیت میں ”لوگوں کے ایک امت ہونے“ کی بات کہی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ابتداء میں راہِ حق پر قائم اور ہدایت یافتہ تھے:

کلم علی شریعتہ من الحق ﴿ابن عباس﴾ کانوا علی الہدیٰ جمیعاً ﴿قادة﴾

﴿ابو جعفر محمد بن جریر طبری، جامع البیان عن تاویل آتی القرآن، المعروف بتفسیر الطبری، دارالمعارف مصر ۵۷۲/۴-۶۷۲، ابو عبد اللہ، الجامع الاحکام القرآن المعروف بتفسیر القرطبی، الہدیتہ المصریۃ العامۃ للکتاب مصر، ۱۹۸۷ء۔ امام رازی نے لکھا ہے: انھم کانوا علی دین واحد وهو الایمان والحق وهو قول اکثر المحققین، بحر الدین الرازی، مفتاح الغیب المعروف بالتفسیر الکبیر، المکتبۃ التوفیقیۃ، مصر ۱۱/۶﴾

بعد میں ان میں اختلاف برپا ہوا۔ اختلاف کا مطلب یہ ہے کہ بعد کے زمانوں میں تمام لوگ راہ حق پر قائم نہ رہ سکے۔ بعض لوگوں میں طرح طرح کی بُرائیاں پیدا ہو گئیں۔ انھوں نے مختلف مظاہر کائنات کو خدائی میں شریک کر لیا، سورج، چاند، ستاروں، درختوں، جانوروں اور دریاؤں وغیرہ کی پرستش شروع کر دی۔ مٹی پتھر کے بت بنا کر انھیں پوجنے لگے۔ انسانی آبادی دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلی اور مختلف قومیں وجود میں آ گئیں۔ ان قوموں کے مذاہب جدا جدا ہو گئے۔ لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے احکام و قوانین کو فراموش کر کے اپنی خواہشوں کی پیروی شروع کر دی۔ جاہلی رسمیں ایجاد کر لی گئیں اور انھی حقیقی دین سمجھا جانے لگا۔

﴿الانبیاء: ۹۳-۹۲﴾

إِنَّ هَذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُونِ ۝ وَتَقَطَّعُوا أَمْرُكُمْ بَيْنَهُمْ كُلُّ إِلَهٍ نَارًا جَعَلُوا

”یہ تمہاری امت حقیقت میں ایک ہی امت ہے اور میں تمہارا رب ہوں، مگر یہ لوگوں کی کارستانی ہے کہ ﴿انھوں نے آپس میں دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ سب کو ہماری طرف پلٹنا ہے۔“

اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر بھیجے اور ان کے ساتھ اپنی روشن تعلیمات بھی بھیجیں۔ تاکہ لوگوں کے درمیان حق اور باطل، صحیح اور غلط کھل کر سامنے آجائے۔ ان پیغمبروں نے ان کے سامنے اللہ کا پیغام پیش کیا، ایک خدا کی پرستش کی دعوت دی، شرک و بت پرستی سے روکا اور صاف الفاظ میں انھیں آگاہ کیا کہ کن کاموں سے اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے اور کن کاموں سے ناراض۔ اس طرح پیغمبروں اور ان کی لائی ہوئی تعلیمات کے ذریعے لوگوں کے اختلاف کا فیصلہ ہو گیا اور حق و باطل میں امتیاز قائم ہو گیا۔ قرآن کہتا ہے:

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيُحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِي مَا اخْتَلَفُوا فِيهِ ۚ ﴿البقرہ: ۲۱۳﴾

”ابتدا میں ﴿سب لوگ ایک ہی طریقے پر تھے﴾ پھر یہ حالت باقی نہ رہی اور اختلافات رونما ہوئے ﴿تب اللہ نے نبی بھیجے جو ﴿راست روی پر ﴿بشارت دینے والے اور ﴿کج روی کے نتائج سے ﴿ڈرانے والے تھے اور ان کے ساتھ کتاب برحق نازل کی، تاکہ حق کے بارے میں لوگوں کے درمیان جو اختلافات رونما ہو گئے تھے، ان کا فیصلہ کرے۔“

اس آیت میں انبیاء کے لیے ”مبشرین“ ﴿بشارت دینے والے﴾ اور منذرین ﴿ڈرانے والے﴾ کے الفاظ آئے ہیں۔ مبشرین کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کی اطاعت کرنے والوں اور اس کے حکموں پر چلنے والوں کو بے پایاں اجر و انعام اور اچھے ٹھکانے کی خوش خبری دیتے ہیں اور منذرین کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی نافرمانی اور کفر کی روش اختیار کرنے والوں کو وہ سخت سزا، زبردست باز پرس اور ہمیشہ کے لئے جہنم میں ڈال دیے جانے سے ڈراتے ہیں۔

﴿تفسیر طبری، ۴/۲۸۰، ابوحیان الاندلسی البحر المحیط، دار احیائ التراث العربی بیروت، ۲۰۰۲ء ۲/۲۱۸﴾

یہ اوصاف، جو انبیاء کرام کے فریضہ منصبی اور مقصد بعثت کی وضاحت کرتے ہیں، قرآن کریم میں متعدد مقامات پر بیان کیے گئے ہیں:

﴿آیت: ۲۸﴾ وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ

”ہم جو رسول بھیجتے ہیں، اسی لیے تو بھیجتے ہیں کہ وہ ﴿نیک کردار لوگوں کے لیے خوش خبری دینے والے﴾ اور ﴿بدکرداروں کے لیے﴾ ڈرانے والے ہوں۔“

[مزید: النساء: ۵۶، الکہف: ۵۶، الصافات: ۲۷ وغیرہ]

آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا إِلَى قَوْمِهِمْ فَجَاءُوهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ ﴿الرّوم: ۴۷﴾

”اور ہم نے تم سے پہلے رسولوں کو ان کی قوم کی طرف بھیجا اور وہ ان کے پاس روشن نشانیاں لے کر آئے۔“

اس آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ انبیاء کرام اپنی قوموں کے پاس ”بیّنات“ لے کر گئے۔ ”بیّنہ“ واضح دلیل کو کہتے ہیں خواہ وہ عقلی ہو یا حسّی ﴿راغب اصفہانی، المفردات فی

غریب القرآن، دار المعرفۃ بیروت، ۹۹۹۱ء ص: ۵۴﴾ البینۃ الادلالۃ الواضیۃ عقلیہ کانت او محسوسہ ﴿اس کا اطلاق انبیاء کو دیے جانے والے معجزات پر بھی کیا گیا ہے اور ان

کے ذریعے انسانوں کو بھیجی جانے والی ہدایات اور تعلیمات پر بھی۔

تمام قوموں میں انبیاء بھیجے گئے

انسانی آبادی دنیا میں جہاں جہاں چھیلی اور جوں جوں اس میں گم راہی عام ہوئی اللہ تعالیٰ نے اس کی ہدایت کا سامان کیا۔ چنانچہ اس نے اپنے برگزیدہ بندوں کو صحیح تعلیمات اور

واضح ہدایات کے ساتھ بھیجا۔ یہ انبیاء تمام قوموں میں مبعوث کیے گئے۔ البتہ قرآن میں صرف ان چند بڑی بڑی قوموں کے احوال ہیں جن سے اہل عرب واقف تھے۔ ان کے

پاس بھیجے جانے والے پیغمبروں اور ان کی دعوت کا بھی تذکرہ ہے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی صراحت کر دی گئی ہے کہ یہ ہادی ورہ نما اور بشارت دینے والے اور ڈرانے والے ہر قوم

میں بھیجے گئے۔ آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے قرآن کہتا ہے:

﴿الرعد: ۷﴾

إِنَّمَا أَنْتَ مُنذِرٌ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ

”تم تو محض خبردار کر دینے والے ہو اور ہر قوم کے لیے ایک رہ نما ہے۔“

إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَإِنْ مِنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ

﴿فاطر: ۲۴﴾

”ہم نے تم کو حق کے ساتھ بھیجا ہے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر، اور کوئی امت ایسی نہیں گزری ہے جس میں کوئی متنبہ کرنے والا

نہ آیا ہو۔“

﴿الحجر: ۱۰﴾

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِي شَيْعِ الْأَوَّلِينَ

”اے نبی! ہم تم سے پہلے بہت سی گزری ہوئی قوموں میں رسول بھیج چکے ہیں۔“

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی خطہ زمین کے انسانوں کو اس حال میں نہیں رہنے دیا کہ ان تک اس کی ہدایت نہ پہنچی ہو۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے تفہیم القرآن جلد چہارم میں اس سلسلے کی ایک غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے لکھا ہے:

”یہ بات قرآن مجید میں متعدد مقامات پر فرمائی گئی ہے کہ دنیا میں کوئی امت ایسی نہیں گزری ہے، جس کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ نے نبی

مبعوث نہ فرمائے ہوں۔ ﴿الرعد: ۷﴾، الحجر: ۱۰، النحل: ۶۳، الشعراء: ۸۰۲﴾ مگر اس سلسلے میں دو باتیں سمجھ لینی چاہئیں تاکہ غلط فہمی نہ ہو۔

اول یہ کہ ایک نبی کی تبلیغ جہاں جہاں پہنچ سکتی ہو وہاں کے لیے وہی نبی کافی ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر ہر بستی اور ہر قوم میں الگ

الگ ہی انبیاء بھیجے جائیں۔ دوم یہ کہ ایک نبی کی دعوت و ہدایت کے آثار اور اس کی رہ نمائی کے نقوش قدم جب تک محفوظ رہیں اُس وقت

تک کسی نئے نبی کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ لازم نہیں کہ ہر نسل اور ہر پشت کے لیے الگ نبی بھیجا جائے۔ ﴿ص: ۲۳۰-۲۳۱﴾

انبیاء ایک ہی دین کے علم بردار تھے

ساتھ ہی قرآن ایک دوسری حقیقت کو بھی واشگاف کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مختلف علاقوں اور خطوں میں اور مختلف قوموں میں جتنے بھی انبیاء بھیجے سب ایک ہی دین کے علمبر

دار تھے اور سب کی بنیادی دعوت ایک ہی تھی۔ ہر نبی کو اسی چیز کی وحی کی گئی تھی کہ اس کائنات کو وجود بخشنے والا اور انسانوں کو پیدا کرنے والا صرف اللہ ہی ہے اس لیے وہی

اس بات کا مستحق ہے کہ صرف اسی کی عبادت کی جائے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے۔ ہر نبی نے اپنی قوم سے اسی کا مطالبہ کیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿الانبیاء: ۲۵﴾

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا نُوحِي إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ

”ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھی بھیجا ہے اس کو یہی وحی کی ہے کہ میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے، پس تم لوگ میری ہی بندگی کرو۔“

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ ﴿٣٦﴾ النحل: ٣٦

”ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیج دیا اور اس کے ذریعے سے سب کو خبردار کر دیا کہ ”اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو۔“

اس آیت میں مابینا کی بنیادی دعوت، یہ قرار دی گئی ہے کہ ”اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو“ عربی زبان میں طاغوت کا مادہ ”طغی“ ہے، اس کے معنی حد سے

آگے بڑھنے، سرکشی کرنے کے ہیں۔ طاغوت میں ہر وہ چیز داخل ہے، جس کی اللہ واحد کو چھوڑ کر، پرستش کی جائے۔ علامہ قرطبی نے اس کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے:

اتى اتركوا كل معبود دون الله كالشيطان و الكاهن والصنم وكل من دعا الى الضلال ﴿ابوعبداللہ قرطبی، الجامع لاحکام

القرآن ﴿تفسیر القرطبی﴾ ٣٠١/٠٠١

”یعنی اللہ کے علاوہ ہر معبود کو چھوڑ دو، جیسے شیطان، کاهن، بت اور ہر وہ چیز جو گمراہی کی طرف لے جائے۔“

امام رازیؒ فرماتے ہیں:

اجتنبوا عبادة ما تعبدون من دون الله، فسمى الكل طاغوتاً

﴿فخر الدین الرازی، مفتاح الغیب المعروف بالتفسیر الکبیر، ٣٢٠/٠٢﴾

”اللہ کے سوا جس جس کی عبادت کرتے ہو، سب کی عبادت ترک کر دو، اللہ کے علاوہ تمام چیزوں کو طاغوت کہا گیا ہے۔“

علامہ ابن کثیرؒ نے ان آیات کی تشریح میں لکھا ہے:

وبعث في كل أمة اى في كل قرن وطائفة من الناس رسولا، وكلهم يدعون الى عبادة الله، ويمنهون عن عبادة ما سواه، فلم يزل تعالى يرسل الى الناس

الرسول بذلك۔ منذ حدث الشرك في بني آدم، في قوم نوح الذين ارسل اليهم نوح، وكان اول رسول بعثه الله الى اهل الارض، الى ان ختمهم

بمحمد صلى الله عليه وسلم الذى طبقت دعوة الانس و الجن فى المشارق والمغارب۔ ﴿بتفسير ابن كثير، مؤسسه الريان

بيروت، ٤٠٠٢ هـ ٣/٣٩٩٢١﴾

”اللہ نے ہر زمانے میں اور لوگوں کے ہر گروہ کے پاس ایک رسول بھیجا۔ یہ سب اللہ کی عبادت کی دعوت دیتے تھے اور اس کے علاوہ

دوسروں کی عبادت سے روکتے تھے۔ سب سے پہلے بنو آدم میں قوم نوح میں شرک پھیلا، اس وقت اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو

ان کے پاس بھیجا۔ وہ پہلے رسول تھے، جنہیں اللہ نے اہل زمین کے پاس بھیجا تھا۔ اس کے بعد وہ برابر لوگوں کی طرف رسول بھیجتا رہا۔ یہاں

تک کہ اس نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر رسالت کا خاتمہ کر دیا۔ آپ ﷺ کی دعوت روئے زمین کے تمام انسانوں اور جنات کے لیے عام تھی۔

ANS 03

اس خطبے کا موضوع ایک سوال ہے۔ اس سوال کا جواب فلسفے نے بھی دیا ہے اور مذہب نے بھی۔ سوال یہ ہے کہ نفس انسانی یا انسانی انا کی ماہیت کیا ہے؟ آغاز کلام میں علامہ قرآن سے استشہاد کرتے ہیں جس کے مطابق انسان اللہ کا برگزیدہ ہے، خلیفہ ہے اور آزاد شخصیت کا امین ہے۔ ۱۔ شعور انسانی کی وحدت انسانی شخصیت کا مرکزہ ہے۔ اسے اسلام کی فکری تاریخ میں کسی خاص دلچسپی کا حامل نہیں سمجھا گیا ۲۔ علامہ کے خیال میں اندریں حالات بہر حال اب ہمارے سامنے کوئی راستہ ہے تو یہ کہ علم حاضر کے احترام اور قدر و منزلت کے باوجود ہم اپنی آزادی رائے برقرار رکھتے ہوئے یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ اسلامی تعلیمات کی تعبیر اب علم حاضر کے پیش نظر کس رنگ میں کرنی چاہیے۔ ۳۔

The only course open to us is to approach modern knowledge with a respectful but independent attitude and to appreciate the teachings of Islam in the light of that knowledge³

خودی کے عناصر ترکیبی یا خواص کیا ہیں؟

خودی کا اظہار اس وحدت میں ہوتا ہے جسے ہم کیفیات نفسی کی وحدت سے تعبیر کرتے ہیں۔ ۴۔

The ego reveals itself as a unity of what we call mental states,⁵

۱۔ وحدت:- کیفیات نفسی کی وحدت

خودی کی دوسری نمایاں خصوصیت بطور ایک وحدت، اس کے خفا یا خلوت کا پہلو ہے جس کی بدولت ہر خودی کی اپنی ایک یکتا حیثیت ہے۔ ۵۔

An other important characteristic of the unity of the ego is its essential privacy which reveals the uniqueness of -2

every ego.⁷

میرا کسی شخص یا کسی مقام کو پہچاننا میری ہی گزشتہ واردات پر مبنی ہو گا، دوسروں کے تجربات اور واردات پر تو نہیں ہو سکتا۔ ۱۰

My recognition of a place or person means reference to my past experience, and not the past experience of another

ego.9

نفس اور روح انسانی کے بارے امام غزالی کے تصور سے علامہ متفق نہیں ہیں:

الہیات اسلامیہ کے اس مذہب میں جس کے امام غزالی شارح اعظم ہیں، 'نخودی' یا 'انا' کی حیثیت ایک سادہ ناقابل تجزیہ اور ناقابل تحول جوہر روحانی کی ہے جسے کیفیات نفسی

کے سارے مجموعے سے کلیتاً مختلف، علیٰ ہذا مرد زمانہ کے اثرات سے سرتاسر آزاد تصور کیا جاتا ہے تھا۔ ۱۲

To the Muslim school of theology of which Ghazali is the chief exponent, the ego is a simple, indivisible, and

immutable soul- substance, entirely different from the group of our mental states and unaffected by the passage of

time, 11

یہ ایک سکونی نظریہ ہے ۱۳ "static view of substance"

اسی طرح علامہ کو ولیم جیمز کے خیال سے بھی اتفاق نہیں ہے، جس کے مطابق خودی یا نفس انسانی:

خودی کیا ہے؟۔ ہمارے ذاتی احساسات، اور اس لیے ہمارے نظام فکر ہی کا ایک حصہ ۱۴

The ego consists of the feelings of personal life, and is as such part of the system of thought. 14

اس لیے کہ:

شعور کے اس نظریے سے ایک تو خودی ہی کی حقیقت کا کوئی سراغ نہیں ملتا دوسرے اس سے محسوسات و مدرکات کا وہ عنصر بھی کالعدم ہو جاتا

This view of consciousness, far from giving us any clue to the ego, entirely ignores the relatively permanent element in experience.

ہے جسے کم از کم اضافی طور پر مستقل ٹھہرایا جاتا ہے۔ ۱۷

There is no continuity of being between the passing thoughts. 16

پس انسانی خودی یا نفس یا احساس ذات یا انا کا خاصہ یہ ہوا کہ وہ شعور کی وحدت رکھتی ہے جو استمرار اور اخفاء سے مرکب ہے۔

ہمارا کہنا یہ ہے کہ ہمارے داخلی محسوسات و مدرکات کا مطلب ہی یہ ہے کہ خودی کا عمل دخل جاری ہے۔ جب ہم کسی شے کا ادراک کرتے، یا اس پر حکم لگاتے، یا کوئی ارادہ

کرتے ہیں تو ایسا کرنے میں خودی ہی سے آشنا ہوتے ہیں۔ ۱۹

Inner experience is the ego at work. We appreciate the ego itself in the act of perceiving, judging and willing. 18

یہی تجربات اور واردات ہیں جس سے اس کی تشکیل اور اس کے نظم و ضبط کا راستہ کھلتا ہے ۲۰

a directive energy and is formed and disciplined by its own experience 20

لہذا میری شخصیت کا یہ مطلب نہیں کہ آپ مجھے شے سمجھیں، میں شے نہیں، عمل ہوں۔ میرے محسوسات و مدرکات کیا ہیں؟ اعمال و افعال کا وہ سلسلہ جن میں ہر عمل

دوسرے پر دلالت کرتا ہے اور جو ایک دوسرے سے وابستہ ہیں تو اس لیے کہ ان میں کوئی رہنما مقصد کام کر رہا ہے۔ میری ساری حقیقت میرے اسی امر آفرین رویے میں

پوشیدہ ہے۔ ۲۳

Thus my real personality is not a thing: it is an act. My experience is only a series of acts, mutually referring to one another, and held together by the unity of a directive purpose. My whole reality lies in my directive attitude.22

ان سب نکات کے بعد بھی معاملہ پوری طرح روشن نہیں ہوا اور کسی قدر ابہام باقی رہ جاتا ہے۔ خودی کی ماہیت پوری وضاحت سے جاننے کے لیے یہ ضروری محسوس ہوتا ہے کہ وہ مقصد تفصیل سے واضح کیا جائے جس کی جانب یہ رہنما توانائی رخ کرتی ہے۔ علامہ نے اس کی توضیح کے لیے ایک دوسرے سوال کا جواب دینے کی سعی کی ہے کہ خودی کا مبداء و منبع کیا ہے؟ قرآن کی آیات- ۲۴ سے دلیل دے کر انہوں نے یہ تصور پیش کیا ہے کہ نفس انسانی یا انسانی خودی یوں پیدا ہوتی ہے۔

ادنیٰ خودیوں کی وہ بستی جن کا اجتماع اور عمل و تعامل جب ایک خاص نسق پر پہنچ جاتا ہے تو اس سے ایک اعلیٰ تر خودی کا صدور ہوتا ہے بالفاظ دیگر یہ ہدایت بالذات کا مرتبہ ہے کہ جب کائنات اس میں قدم رکھتی ہے تو حقیقت مطلقہ شاید اپنا راز افشا کرتی اور یوں اپنی ماہیت کے انکشاف کا راستہ کھول دیتی ہے۔ ۲۶

ANS 04

فلسفہ اور سائنس کی نئی نئی چاندی دیکھ کے لوگ مذہب کا انکار کر بیٹھتے ہیں لیکن جب انکا سامنا اپنی فطرت انسانی کے سوالات سے ہوتا ہے تو انہیں پتا چلتا ہے کہ ہماری اصل ضرورت اور سوالات تو یہ تھے۔۔۔ ان سوالات کا جواب ناسائنس کے پاس ہے اور ناسائنس انکا کوئی معقول جواب دیتا ہے۔ حقیقت میں ان کا جواب انسانی علم دے ہی نہیں سکتا تھا اس لیے وحی کے راستے سے اس ضرورت کا سامان کیا گیا ، وہ سوالات یہ ہیں:

1. عالم بحیثیت مجموعی کیا ہے؟
2. اس کی ابتداء کیسے ہوئی؟
3. انتہاء کیا ہوگی؟
4. ذہن اور موجودات کی خارجی کی اصل حقیقت کیا ہے؟
5. ہم کیا ہیں؟
6. کہاں سے آئے؟
7. ہم نے کہاں جانا ہے؟
8. ہمارا آنے جانے کا مقصد کیا ہے؟

یہ انسانی فطرت کے بنیادی سوالات ہیں، آدمی ایک ایسی دنیا میں آنکھ کھولتا ہے، جہاں سب کچھ ہے مگر یہی ایک چیز نہیں، سورج اس کو روشنی اور حرارت پہنچاتا ہے مگر وہ نہیں

جانتا کہ وہ کیا ہے اور کیوں انسان کی خدمت میں لگا ہوا ہے، ہوا اس کو زندگی بخشی ہے مگر انسان کے بس میں نہیں ہے کہ وہ اس کو پکڑ کر پوچھ سکے کہ تم کون ہو اور کیوں ایسا کر رہی ہو، وہ اپنے وجود کو دیکھتا ہے، اور نہیں جانتا کہ میں کیا ہوں اور کس لئے اس دنیا میں آگیا ہوں؟ ان سوالات کا جواب متعین کرنے سے انسان کا ذہن قاصر ہے، مگر بہر حال ان کو معلوم کرنا چاہتا ہے، یہ سوالات خواہ لفظوں کی شکل میں متعین ہو کر ہر شخص کی زبان پر نہ آئیں مگر وہ انسان کی روح کو بے چین رکھتے ہیں، اور کبھی کبھی اس شدت سے ابھرتے ہیں کہ آدمی کو پاگل بنا دیتے ہیں۔ یہی وہ سوالات ہیں جنہوں نے بڑے بڑے فلاسفہ اور سائنسدانوں کو اپنے شعبے سے ہٹ کے تحقیق کرنے پر مجبور کیا۔ کچھ نے ان سوالات سے مجبور ہو کے اپنا ایک عقلی خدا کا تصور تیار کیا، کچھ ہندومت، بدھ مت کے روحانی فلسفوں میں کھو گئے، کچھ اس تحقیق کے بعد اس سچائی کو پا گئے جو خالق کائنات نے اپنے آخری نبی کے ذریعے پیش کی۔ یہی حال مسلم فلسفیوں کا ہے، چند دن پہلے ایک مسلم فلسفی کے متعلق پڑھ رہا تھا، ان سے پوچھا گیا کہ فلسفے اور منطق کے اتنے گہرے علم کے بعد بھی آپ مذہب کی ضرورت کے کیسے قائل ہوئے؟ انہوں نے اس کا جواب دیا کہ فلسفہ اور سائنس اپنی پوری کوشش کے بعد بھی انسان اور کائنات کی مقصدیت بیان نہیں کر سکتے۔ یہ کائنات اور ہم کیا ہیں، ہمارا مقصد کیا ہے، ہم کیوں آئے ہیں، ہم نے کہاں

جانا ہے۔ اسکا معقول جواب صرف مذہب اسلام دیتا ہے۔

جواہر لال نہرو دنیا کے تیسرے سب سے بڑے ملک کے وزیر اعظم تھے، جنوری 1964ء کے پہلے ہفتے میں مستشرقین کی بین الاقوامی کانگریس نئی دہلی میں ہوئی جس میں ہندوستان اور دوسرے ممالک کے بارہ سو ڈیلی گیٹ شریک ہوئے، پنڈت نہرو نے اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا: ”میں ایک سیاست داں ہوں اور مجھے سوچنے کے لئے وقت کم ملتا ہے پھر بھی بعض اوقات میں یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہوں کہ آخر یہ دنیا کیا ہے، کس لئے ہے، ہم کیا ہیں اور ہم کیا کر رہے ہیں، میرا یقین ہے کہ کچھ طاقتیں ہیں جو

ہماری تقدیر بناتی ہیں۔ (National Herald, Jan, 6, 1964) ”

یہ ایک عدم اطمینان ہے، جو ان تمام لوگوں کی روحوں پر گہرے کھر کی طرح چھایا رہتا ہے جنہوں نے خدا کو اپنا الہ اور معبود بنانے سے انکار کیا، دنیا کی مصروفیتوں اور وقتی دلچسپیوں میں عارضی طور پر کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اطمینان سے ہم کنار ہیں، مگر جہاں یہ مصنوعی ماحول ختم ہوا، حقیقت اندر سے زور کرنا شروع کر دیتی ہے، اور انہیں یاد دلاتی ہے کہ وہ سچے اطمینان سے محروم ہیں۔۔۔

ان سوالات کا جواب دینا ناگزیر ہے۔ کوئی چاہے یا نہ چاہے، اسے پسند ہو یا نا پسند، خاموش رہے یا چلا کر بولے، بہر حال میں اس سوال کا جواب لازماً دے کر رہے گا۔ اب اسکا ایک جواب وہ ہے جو انبیائے کرام نے تسلسل کے ساتھ بتایا (اور اس جواب پر انسان اپنے نفس کے اندر بہر حال ایک اثباتی داعیہ بھی محسوس کرتا ہے گو کہ وہ قول فیصل کی حیثیت نہیں رکھتا) اور دور جدید میں اسکا دوسرا جواب وہ ہے جو چند ملحد سائنس دان اور فلسفی دیتے ہیں۔ یہ بات خوب اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ ان ملحدین کا جواب کسی مجرد، آفاقی یا معروضی عقلیت نہیں بلکہ انکے ماقبل عقل احساسات و خواہشات پر مبنی ہوتا ہے جنکے لئے انکی عقل کوئی جواز پیش نہیں کر سکتی۔

الغرض اس سوال کے جواب میں بہر حال انسانی عقل کو ایمان ہی لانا پڑتا ہے۔ یعنی معاملہ یہ نہیں ہے کہ ایک جگہ تو ایمان ہے اور دوسری جگہ عقل وغیرہ۔ ہرگز نہیں، ان دونوں ڈسکورس میں سے ہر دو میں اپنی نوعیت کے اعتبار سے معاملہ ایک ہی ہے کہ ان میں سے کس کی بات پر ایمان لایا جائے، انبیاء کی یا انسانی خواہشات کی۔ لہذا ملحدین کا یہ اعتراض کہ مذہب اس لئے ڈائجمنٹک ہوتا ہے کیونکہ وہ ایمان کا تقاضا کرتا ہے جبکہ ہم ایمان کی بجائے عقل کی بات کرتے ہیں فریب کاری اور نا سمجھی کے سواء اور کچھ نہیں۔ اس تحریر میں اس موضوع کو ہم فلسفہ اور سائنس کے پہلو سے تفصیل سے زیر بحث لارہے ہیں۔

فطرت انسانی کے سوالات اور سائنس

فطرت انسانی کی ان بے چینیوں اور اضطراب کا جواب سائنس کے پاس نہیں کیونکہ سائنس کی حجت و تحقیق کا تعلق تمام تر فطرت کے ان واقعات اور مشاہدات سے ہے جو ہمارے زیر تجربہ آسکیں۔ لیکن جو چیزیں ہمارے احساس اور مشاہدے کے دائرے سے خارج ہیں سائنس کو ان کے اقرار و انکار سے کچھ بحث نہیں۔ یہ حوادث و واقعات کے محض ان حلقوں کو ترتیب کے ساتھ ہمیں بتانے کی کوشش کرتی ہے جو اس کے دائرہ احساس و مشاہدے میں آجاتے ہیں۔ ہمارے سامنے جو قدرتی قوانین پھیلے ہوئے ہیں ہم ان کو بنا نہیں سکتے بلکہ جان سکتے ہیں۔ اور سائنس اس پر اتنا اور اضافہ کرتی ہے کہ اسی حد تک جان سکتے ہیں جس حد تک مشاہدہ ہمارا ساتھ دے گا۔ لیکن یہ سوال کہ ان قوانین کا مقنن کون ہے؟ ان کا نقطہ آغاز کیا ہے اور ان کا آخری انجام کیا ہوگا؟ سائنس کی حدود سے اس کا جواب خارج ہے۔ سائنس صرف عالم شہادت ”عالم محسوس“ کے چند واقعات محسوسہ کو کلیات کی شکل میں پیش کر کے اپنے بازو ڈال دیتی ہے۔ محسوسات کے آگے قدم رکھتے ہی اس پر رعب طاری ہو جاتا ہے۔ وہ کچھ نہیں کہہ سکتی کہ آگے کیا ہے؟ اور مذہب انسان کا یہی سے ہاتھ پکڑتا ہے اور غیب ”عالم محسوس“ کے سہارے اسرار کو اس کے سامنے بے نقاب کرتا چلا جاتا ہے۔ سائنس کچھ نہیں بتا سکتی کہ دنیا کی ابتدا کیوں کر ہوئی۔ مذہب آتا ہے اور اس حقیقت سے پردہ اٹھا دیتا ہے۔ انسان مرنے کے بعد کہاں جاتا ہے اور اس پر کیا گزرتی ہے؟ سائنس اس کے جواب سے عاجز ہے اور مذہب اس کی تفصیل پیش کرتا ہے۔ دنیا کا آخری انجام کیا ہوگا؟ سائنس متحیر کے کہ اس کا کیا جواب دے؟ مذہب آتا ہے اور اس حیرت کو مٹا دیتا ہے۔ سائنس یہ تو بتاتی ہے کہ عالم کس کے لیے ہے۔ لیکن خود انسان کس کے لیے ہے اس مقصد کو متعین کرنے سے وہ عاجز ہے۔ مذہب آتا ہے اور اس مسئلے کو بھی صاف کر دیتا ہے۔ یہی وہ سوالات ہیں جو ہماری فطرت کی گہرائیوں سے ابل ابل کر ہمیں مذہب کے قریب لانے اور اپنی بے یقین و بے حس روح کو مذہب کی حقیقت آفرینیوں اور بصیرت افروزیوں میں آسودگی و آرام حاصل کرنے کی طرف کشاں کشاں لیے جاتے ہیں۔

انسان-سائنس جسے دریافت ناکرپائی

نوبل انعام یافتہ سائنسدان الکسس کیرل لکھتا ہے: ”انسان ایک انتہائی پیچیدہ اور ناقابل تقسیم کل ہے۔ کوئی چیز بھی آسانی کے ساتھ اس کی نمائندگی نہیں کر سکتی۔ کوئی ایسا طریقہ نہیں ہے جس کے ذریعہ ہم بیک وقت اس کی پوری ذات کو اس کے اجزاء اور بیرونی دنیا کے ساتھ اس کے تعلقات کو بخوبی سمجھ سکیں۔ اپنی ذات کا تجزیہ کرنے کیلئے

ہمیں مختلف فنی مہارتوں سے مدد لینی پڑتی ہے۔ اور اس طرح مختلف علوم سے کام لینا ہوتا ہے۔ فطری طور پر یہ تمام علوم اپنے کسی عام مقصد کے متعلق کسی ایک متحدہ تصور پر نہیں پہنچتے۔ وہ انسان سے صرف انہیں چیزوں کی تجرید کرتے ہیں جو ان کے خاص طریقوں سے حاصل ہو سکتی ہے اور ان مجردات کو ایک دوسرے سے ملا بھی دیا جائے تو وہ ایک ٹھوس حقیقت سے بھی کم قیمتی ہوتے ہیں۔ ان مجردات کے بعد بھی ایک ایسی ذات باقی رہتی ہے جو بہت ہی اہم ہوتی ہے اور اس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ علم تشریح، کیمیا، فعلیات، نفسیات، تعلیمات، تاریخ، سماجیات، سیاسی اقتصادیات اپنے موضوع کو پورے طور پر ختم نہیں کرتے۔ وہ انسان جس سے خصوصی ماہرین آشنا ہیں، حقیقی انسان سے بہت دور ہوتا ہے۔ وہ (انکی تحقیق) ایک مفروضہ کے سوا اور کچھ نہیں جو مختلف مفروضات پر مشتمل ہے۔ اور جن کو ہر ایک علم کی فنی مہارتوں نے پیدا کیا ہے۔ انسان بیک وقت ایک لاش ہے جس کو تشریح کا عالم چیرتا پھاڑتا ہے، وہ ایک شعور ہے جس کا ماہرین نفسیات اور بڑے بڑے روحانی اساتذہ مشاہدہ کرتے ہیں۔ وہ ایک شخصیت ہے جس کے اندر دیکھنے سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ وہ اس کی ذات کی گہرائیوں میں پوشیدہ ہے، وہ کیمیائی مادہ بھی ہے جس سے جسم کی نیسیجیں اور خلطیں بنتی ہیں وہ خلیوں اور تغذیاتی رطوبتوں کا ایک حیرت انگیز گروہ ہے جن کے جسمانی قوانین کا مطالعہ ماہرین فعلیات کرتے ہیں، وہ نیسیجوں اور شعور سے مرکب ہے جس کو حفظان صحت اور تعلیمات کے ماہرین، جب کہ وہ زمان کے اندر پھیل رہا ہو، امید افزا ترقی دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ ایک گھریلو اقتصادیات کا حامل ہے جس کا کام پیدا کی ہوئی چیزوں کو استعمال کرتے رہنا ہے تاکہ مشینیں جن کا وہ غلام بن گیا ہے برابر کام کرتی رہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ وہ ایک شاعر، سورما اور ولی بھی ہے، وہ نہ صرف ایک انتہائی پیچیدہ ہستی ہے جس کا تجزیہ سائنس کی فنی مہارتوں کے ذریعہ کیا جا رہا ہے بلکہ وہ انسانیت کے رجحانات قیاسات اور آرزوؤں کا مرکز ہے۔ بلاشبہ انسانیت نے اپنی حقیقت کو معلوم کرنے کی بڑی زبردست کوشش کی ہے، آج ہمارے پاس تمام زمانوں کے سائنس دانوں فلسفیوں، شاعروں اور بڑے بڑے صوفیوں کے مشاہدات کا ایک انبار موجود ہے مگر ہم اپنی ذات کے صرف چند پہلوؤں کو دریافت کر سکے ہیں، ہم انسان کو اس کی کلی حیثیت میں بخوبی سمجھ نہیں سکے ہیں۔ ہم اس کو الگ الگ حصوں سے مرکب جانتے ہیں اور یہ حصے بھی ہمارے اپنے طریقوں کے پیدا کردہ ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص ایک خیالی پیکر ہے جس کے اندر سے ایک نامعلوم حقیقت جھلک رہی ہے۔ حقیقت میں ہماری ناواقفیت بہت گہری ہے۔ وہ لوگ جو انسانی ہستیتوں کا مطالعہ کرتے ہیں، اپنے آپ سے بہت سے ایسے سوالات کرتے ہیں جن کا کوئی جواب نہیں ہے۔ ہماری اندرونی دنیا کے وسیع علاقے اب تک نامعلوم ہیں۔ خلیے کے پیچیدہ اور عارضی اعضاء کے بنانے کے لئے کس طرح کیمیائی مادوں کے سالمے باہم مل جاتے ہیں؟ تروتازہ بیضہ کیے نیوکلئیس کے اندر کے نسلی مادے کس طرح اس فرد کی خصوصیات کا فیصلہ کرتے ہیں جو اس بیضہ سے پیدا ہوتا ہے؟ کس طرح خلیے خود اپنی کوششوں سے نیسیجوں اور اعضاء کے جیسے گروہوں میں منظم ہو جاتے ہیں چیونٹیوں اور شہد کی مکھیوں کی طرح ان خلیوں کو پہلے ہی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اپنے گروہ کو زندہ رکھنے میں انہیں کیا کام کرنا ہے۔؟ اور چھپی ہوئی بناوٹوں کے ذریعہ وہ ایک ایسے نظام جسمانی کے بنانے کے قابل ہوتے ہیں جو سادہ اور پیچیدہ دونوں ہوتا ہے۔ ہماری مدت (Duration)، فعلیاتی وقت (Physiological Time) اور نفسیاتی وقت (Psychological) کی نوعیت کیا ہے۔؟

ہم یہ جانتے ہیں کہ ہم نسیجوں، اعضاء، طوبتوں اور شعور سے مرکب ہیں۔ لیکن شعور اور دماغ کے درمیانی تعلقات اب تک ایک راز بنے ہوئے ہیں۔ ہمیں اعصابی خلیوں کے فعلیات کا پورا پورا علم حاصل نہیں۔ ارادی قوت کس حد تک نظام جسمانی میں تبدیلیاں پیدا کرتی ہے، کس طرح دماغ اعضاء کے حالات سے متاثر ہوتا ہے، طرز زندگی غذا کے کیمیائی مادوں، آب و ہوا اور فعلیاتی اور اخلاقی تربتوں کے ذریعہ کس طرح جسمانی اور دماغی خصوصیات میں جو بطور ورثہ ہر ایک فرد کو ملتی ہیں، تبدیلیاں پیدا کی جاسکتی ہیں۔۔۔ اس طرح بہت سے دوسرے سوالات کیے جاسکتے ہیں جن کا جواب نہیں دیا جاسکتا ہے، یہ صاف ظاہر ہے کہ ایک انسان کے متعلق تمام علوم کی مہارت بھی ناکافی ہے، اور یہ کہ اپنی ذات کے متعلق ہمارا علم اب تک ابتدائی حالت میں ہے۔“ (Man The Unkhown P.16,19)

یہ اقتباس یہ ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے کہ انسان کا مکمل علم ابھی تک انسان کو حاصل نہیں ہو سکا۔ انسانی وجود کے مادی حصہ کے بارے میں تو ہم بہت کچھ جانتے ہیں۔ مگر وہ انسان جو اس مادی وجود کو کنٹرول کرتا ہے اس سے ہم قطعاً علم ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ زندگی اب تک ہمارے لئے ایک راز بنی ہوئی ہے اور جب تک یہ راز نہ کھلے زندگی کی صحیح و تشکیل ممکن نہیں۔

انسان کی حقیقت معلوم کرنے کی کوشش ایک مثال فرض کیجئے ایک شخص اپنے ذمہ یہ کام لیتا ہے کہ وہ انسانیت کی حقیقت کو معلوم کرے گا، اور انسانوں کو بتائے گا کہ زندگی کا قانون کیا ہے۔؟ اس مقصد کے لئے وہ انسانی آبادیوں سے اپنے مطالعہ کا آغاز کرتا ہے۔ لمبے عرصہ تک مختلف سماجوں کی چھان بین کرنے کے بعد اس کو محسوس ہوتا ہے کہ سماج تو انسانوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ اس لئے جب تک ہم فرد کو سمجھ نہ لیں، جماعت کو کس طرح سمجھ سکتے ہیں۔ اب وہ معاشرہ کو چھوڑ کر انسان کا مطالعہ شروع کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ سب سے پہلے نفسیات کی طرف رخ کرتا ہے، یہاں وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کا کوئی ایک فکر نہیں بلکہ اس کی بہت سی شاخیں ہیں۔ اور سب کے نتائج تحقیق الگ الگ ہیں۔ نفسیات کی ایک شاخ کا دعویٰ ہے کہ انسان کے تمام اعمال کا مرکز اس کا احساس ہے۔ کسی کا کہنا ہے کہ انسان خارجی دنیا سے شعوری یا غیر شعوری طور پر جو تاثر قبول کرتا ہے اس کا ہر کام اسی کا رد عمل ہے، کوئی جنسی خواہشات کو اس کے تمام اعمال کا محرک بتاتا ہے، کسی کا مطالعہ یہ ہے کہ اپنے آئیڈیل کو پالینے کا نام معلوم جذبہ انسان کو متحرک کئے ہوئے ہے۔ کوئی مکتب فکر شعور کو اصل قرار دیتا ہے اور اسی کی روشنی میں انسان کی پوری ہستی کی تشریح کرتا ہے۔ اور کوئی اس بات کا قائل ہے کہ عقل اور ذہن کوئی چیز نہیں۔ انسان کے مختلف اعضاء کی عنان کسی ایک مرکزی قوت کے ہاتھوں میں نہیں بلکہ انسان جس حصہ جسم پر زیادہ توجہ دیتا ہے اس کی نشوونما بہتر طریقہ سے ہو جاتی ہے۔ اس کے نتیجہ میں کوئی اچھا قاص بن جاتا ہے، کوئی اچھا مفکر۔ اسی طرح ہزاروں نظریات ہیں، نفسیات کا یہ اختلاف اس حد تک بڑھا ہوا ہے کہ بعض سرے سے اس واقعہ کا انکار کرتے ہیں کہ اس نام کا کوئی علم فی الواقع موجود ہے۔ خیالات کے اس جنگل کو دیکھ کر وہ سوچتا ہے کہ انسانی وجود کے دوسرے حصے حیاتیات کا مطالعہ کرے تاکہ دونوں کے نتائج کو ملا کر کوئی رائے قائم کی جاسکے جب انسان کو وہ

اس حیثیت سے دیکھتا ہے تو اسے نظر آتا ہے کہ انسانی نظاموں کی بنیاد چند کیمیائی تبدیلیوں پر ہے جو کچھ کیمیائی اشیاء اور ان کے آپس کے عمل اور رد عمل سے پیدا ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جسم کا سارا نظام کیمیائی تحلیل کا ہی ایک پیکر ہے۔ اب وہ غور کرتا ہے تو اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ جب جسم انسانی کا وجود اور اس کا نشوونما کیمیائی رد و بدل کا مرہون منت ہے تو پہلے کیمیائی تبدیلیوں کے اصولوں کو ہی اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے اس کے بغیر انسان کے بارے میں حقیقی اور قابل اطمینان معلومات نہ مل سکیں گی۔ اس لئے اب وہ کیمیا اور طبیعیات کا مطالعہ کرنے لگتا ہے اور اس میں ایک عمر کھپا دیتا ہے۔ کیمیات اور طبیعیات کا مطالعہ اسے مالیکیول اور ایٹم کے مطالعہ تک لے جاتا ہے اور پھر وہ ایٹم کے اجزائے ترکیبی الیکٹران اور پروٹان وغیرہ کا مطالعہ شروع کر دیتا ہے جس کے بعد اس کو معلوم ہوتا ہے کہ ساری کائنات برقی لہروں کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس طرح مطالعہ کرتے کرتے بالآخر وہ جدید سائنس کے آخری شعبے نیوکلیر سائنس میں داخل ہو جاتا ہے اس طرح معلومات کا عظیم دفتر جمع کرنے کے باوجود وہ کسی نتیجہ پر نہیں پہنچتا --- یہ وہ ہے جو خالق کی حقیقت جاننے چلا تھا وہ مخلوق کی ایک جنس کی حقیقت معلوم کرنے کی کوشش میں ہی ایک ایسی دنیا میں گم ہو گیا جو نظر آنے کے باوجود نظر نہیں آتی۔۔۔ زندگی کے راز کو مادی علوم میں تلاشی کرنے کا یہ عبرت ناک انجام بتاتا ہے کہ زندگی کا راز زندگی کو پیدا کرنے والے کی تفصیلات سے فائدہ اٹھائے بغیر انسان کے لئے نا قابل دریافت ہے۔ جس طرح ایک بیمار شخص کی یہ معذوری کہ وہ خود اپنا علاج نہیں کر سکتا، اس کو یہ ماننے پر مجبور کرتی ہے کہ اس کو ایک ڈاکٹر کے پاس جانا چاہئے۔ اسی طرح نظام فطرت میں انسان کا ایک چیز کے لئے ضرورت مند ہونا اور پھر اس ضرورت کی تکمیل کے لئے کافی صلاحیت نہ رکھنا اس بات کا اشارہ ہے کہ اس کیلئے وہ اپنے اس خدا کا محتاج ہے جس نے اسے موجودہ شکل میں بنایا۔ جس طرح خدا نے اسے آکسیجن کا محتاج بنایا ہے اور پھر آکسیجن بے حساب مقدار میں سارے کرہ ارض کے گرد پھیلا دی۔ اسی طرح اس نے انسان کو زندگی کی حقیقت جاننے کا محتاج بنایا۔ اور پھر اپنے نبیوں کے ذریعہ زندگی کی حقیقت واضح فرمائی۔

کائنات کی اتفاقی اور خود کار پیدائش کا نظریہ

اٹھارویں اور انیسویں صدی کی سائنس نے جب یہ دریافت کیا کہ کائنات میں علت اور معلول کا ایک نظام ہے تو اس زمانہ کے ملحد مفکرین نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ان کے نزدیک یہ دریافت خدا کا سائنسی بدل تھا۔ اگرچہ اس قانون کو دریافت کرنے والے سائنس دانوں کے لئے اس کے یہ معنی نہیں تھے۔ مثال کے طور پر نیوٹن نے کہا تھا کہ یہ خدا کا طریق کار ہے۔ خدا اسباب و علل کے ذریعہ کائنات میں اپنی منشاء کو ظاہر کرتا ہے۔ مگر وہ لوگ جو سائنسی دریافتوں کی روشنی میں فلسفہ کی تشکیل کر رہے تھے، انہوں نے اس کے اندر الحاد کا ثبوت پالیا۔ اور اس کی بنیاد پر ایک پورا نظام فکر بنا ڈالا۔ اس طرح وہ نظریہ وجود میں آیا جس کو کائنات کی مشینی تعبیر کہا جاتا ہے۔ مسلمہ طور پر یہ مان لیا گیا ہے کہ کائنات کے تمام واقعات کسی خارجی مداخلت کے بغیر محض مادی اسباب کے تحت واقع ہوتے ہیں اور اس طرح پوری کائنات علت و معلول کی ایک مسلسل زنجیر میں بندھی ہوئی ہے۔ یہ انیسویں صدی عیسوی کا مسلمہ تھا۔ ۱۸۷۴ میں چھپنے والی ایک انسائیکلو پیڈیا کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

”طبعی فلاسفہ کیمسٹری اور فزیالوجی کے ماہرین یقین رکھتے ہیں کہ ایک سبب سے ہمیشہ یکساں نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ اور ایک مثال میں اگر ایک تصور کامیاب ہو تو ان کو اطمینان ہے کہ ہمیشہ یہی کامیابی حاصل ہوگی۔ اس لئے طبعی علوم میں اب قانون تعلیل کے بارہ میں کوئی اختلاف نہیں رہ گیا ہے۔ اس باب میں اختلاف صرف مابعد الطبیعیات حلقہ

میں پایا جاتا ہے۔“ 691 p. V.II (1874) Chamber's Encyclopaedia

مگر ان مفکرین کی یہ خوشی زیادہ دیر تک باقی نہیں رہی۔ کیونکہ بیسویں صدی کے شروع ہوتے ہی سائنس کے علم میں ایسے بہت سے حقائق وجود میں آئے جو کسی طرح مشینی تعبیر کو قبول کرنے کیلئے تیار نہ تھے۔ طویل بحث و مباحثہ کے بعد اب سائنس کی دنیا میں تسلیم کر لیا گیا ہے کہ قانون تعلیل ان معنوں میں کوئی مطلق حقیقت یا توجیہ نہیں ہے جیسا کہ انیسویں صدی میں فرض کر لیا گیا تھا۔ علم کا مسافر دوبارہ لوٹ کر وہیں پہنچ گیا ہے جہاں وہ پہلے تھا۔ ”اس دنیا کا نظام محض اتفاقی طور پر وجود میں آ جانے والے کسی علت و معلول کے قانون کے تحت نہیں چل رہا ہے بلکہ اس کے پیچھے ایک شعوری ذہ ہے جو بالا ارادہ اس کو چلا رہا ہے۔“ سائنس کی واپسی مذہب کی صداقت کا ایک ایسا واضح ثبوت ہے جس کے بعد کسی اور ثبوت کی ضرورت نہیں۔

پچھلے پچاس برسوں میں اس سلسلہ میں بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں یہاں ہم اس مسئلہ کو مختصر طور پر واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔ اصول تعلیل کے بارے میں آگے جو باتیں درج ہیں وہ زیادہ تر سر جیمز جینز کی کتاب بر اسرار کائنات سے ماخوذ ہے۔ کائنات کو دیکھتے ہی جو سب سے پہلا سوال ذہن میں آتا ہے کہ اس کا بنانے والا کون ہے اور وہ کون ہے جو اس عظیم کارخانہ کو چلا رہا ہے۔ پچھلے زمانوں میں انسان یہ سمجھتا تھا کہ بہت سی غیر مرئی طاقتیں اس کائنات کی مالک ہیں۔ ایک بڑے خدا کے تحت بہت سے چھوٹے چھوٹے خدا اس کا انتظام کر رہے ہیں، اب بھی بہت سے لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں۔ مگر علمی دنیا میں عام طور پر یہ نظریہ ترک کیا جا چکا ہے۔ یہ ایک مردہ نظریہ ہے نہ کہ زندہ نظریہ۔ موجودہ زمانہ کے لوگوں کا خیال ہے کہ کائنات کسی ذی شعور ہستی کی کار فرمائی نہیں ہے بلکہ ایک اتفاقی حادثہ کا نتیجہ ہے اور جب کوئی واقعہ وجود میں آجائے تو اس کے سبب سے کچھ دوسرے واقعات بھی وجود میں آجائیں گے۔ اس طرح اسباب و واقعات کا ایک لمبا سلسلہ قائم ہو جاتا ہے اور یہی سلسلہ اسباب ہے جو کائنات کو چلا رہا ہے۔ اس توجیہ کی بنیاد دو چیزوں پر ہے ایک ”اتفاق“ اور دوسرے ”قانون علت“۔ یہ توجیہ بتاتی ہے کہ اب سے تقریباً دو لاکھ ارب سال۔ ۲۰ نیل سال پہلے کائنات کا وجود نہیں تھا، اس وقت نہ ستارے تھے اور نہ سیارے مگر فضا میں مادہ موجود تھا۔ یہ مادہ اس وقت جمی ہوئی ٹھوس حالت میں نہ تھا بلکہ اپنے ابتدائی ذرے یعنی برقیے اور پروٹانوں کی شکل میں پوری فضا بسیط میں یکساں طور پر پھیلا ہوا تھا گویا انتہائی چھوٹے ذرات کا ایک غبار تھا جس سے کائنات بھری ہوئی تھی۔ اس وقت مادہ بالکل توازن کی حالت میں تھا، اس میں کسی قسم کی حرکت نہ تھی۔ چنانچہ ایسا ہوا کہ مادہ کے اس بادل میں خفیف سا خلل واقعہ ہوا۔ جیسے کوئی حوض کے پانی کو ہاتھ ڈال کر ہلا دے۔ کائنات کی پرسکون دنیا میں یہ اضطراب کس نے پیدا کیا، اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ لیکن خلل بڑھتا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مادہ سمٹ کر مختلف جگہوں میں جمع ہونا شروع ہو گیا۔ یہی وہ جمع شدہ مادہ ہے جس کو ہم ستارے، سیارے اور سحابیے کہتے ہیں۔

کائنات کی یہ توجہ سائنس کی طرف سے پیش کی گئی تھی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ اس قدربودی اور کمزور توجیہ ہے کہ خود سائنس دانوں کو بھی اس پر کبھی شرح صدر حاصل نہ ہو سکا۔ یہ توجیہ اس حقیقت کو تسلیم کرتی ہے کہ اسے نہیں معلوم کہ کائنات کو پہل بار کس نے حرکت دی، مگر اس کے باوجود اس کا دعویٰ ہے کہ اس نے کائنات کے محرک اول کو معلوم کر لیا ہے اور اس محرک اول کا نام اس کے نزدیک اتفاق ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب کائنات میں صرف غیر متحرک مادہ تھا، اس کے سوا کوئی چیز موجود نہ تھی تو یہ عجیب و غریب اتفاق کہاں سے وجود میں آگیا جس نے ساری کائنات کو حرکت دے دی جس واقعہ کے اسباب نہ مادہ کے اندر موجود تھے اور نہ مادہ کے باہر وہ واقعہ وجود میں آیا تو کیسے آیا۔ اس توجیہ کا یہ نہایت دلچسپ تضاد ہے کہ ہر واقعہ سے پہلے ایک واقعہ کا موجود ہونا ضروری قرار دیتی ہے جو بعد کو ظاہر ہونے والے واقعہ کا سبب بن سکے مگر اس توجیہ کی ابتدا ایک ایسے واقعہ سے ہوتی ہے جس سے پہلے اس کا سبب موجود نہیں۔ یہی وہ بے بنیاد مفروضہ ہے جس میں کائنات کی اتفاقی پیدائش کے نظریہ کی پوری عمارت کھڑی کر دی ہے۔

یہ کائنات اگر محض اتفاق سے وجود میں آئی ہے تو کیا واقعات لازمی طور پر وہی رخ اختیار کرنے پر مجبور تھے جو انہوں نے اختیار کیا۔ کیا اس کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا تھا؟ کیا ایسا ممکن نہیں تھا کہ ستارے آپس میں ٹکرا کر تباہ ہو جائیں۔ مادہ میں حرکت پیدا ہو جانے کے بعد کیا یہ ضروری تھا کہ محض حرکت نہ رہے بلکہ ایک ارتقائی حرکت بن جائے۔ اور حیرت انگیز تسلیل کے ساتھ موجودہ کائنات کو وجود میں لانے کی طرف دوڑنا شروع کر دے۔ آخر وہ کون سی منطق تھی جس نے ستاروں کے وجود میں آتے ہی ان کو لامتناہی خلا میں نہایت باقاعدگی کے ساتھ پھیرنا شروع کر دیا۔ پھر وہ کون سی منطق تھی جس نے کائنات کے ایک بعید ترین گوشہ میں نظام شمسی کو وجود دیا؟؟ وہ کون سی منطق تھی جس سے ہمارے کرہ زمین پر وہ عجیب و غریب تبدیلیاں ہوئیں جن کی وجہ سے یہاں زندگی کا قیام ممکن ہو سکا اور جن تبدیلیوں کا سراغ آج تک کائنات کی بے شمار دنیاؤں میں سے کسی ایک دنیا میں معلوم نہ کیا جا سکا ہے۔ وہ کون سی منطق تھی جو ایک خاص مرحلہ پر بے جان مادہ سے جاندار مخلوق پیدا کرنے کا سبب بن گئی۔ کیا اس بات کی کوئی معقول توجیہ کی جاسکتی ہے کہ زمین پر زندگی کس طرح اور کیوں وجود میں آئی اور کس قانون کے تحت مسلسل پیدا ہوتی چلی جا رہی ہے۔ وہ کون سی منطق تھی جس نے کائنات کے ایک چھوٹے سے رقبہ میں حیرت انگیز طور پر وہ تمام چیزیں پیدا کر دیں جو ہماری زندگی اور ہمارے تمدن کے لئے درکار تھیں؟؟ پھر وہ کون سی منطق ہے جو ان حالات کو ہمارے لئے باقی رکھے ہوئے ہے۔ کیا محض ایک اتفاقی کا پیش آجانا اس بات کی کافی وجہ تھی کہ یہ سارے واقعات اس قدر حسن و ترتیب کے ساتھ مسلسل پیش آتے چلے جائیں اور اربوں و کھربوں سال تک ان کا سلسلہ جاری رہے اور پھر بھی ان میں کوئی فرق نہ آنے پائے۔؟؟

کیا اس بات کی کوئی واقعی توجیہ کی جاسکتی ہے کہ محض اتفاق سے پیش آجانے والے واقعہ میں لزوم کی صفت کہاں سے آگئی اور اتنے عجیب و غریب طریقہ پر مسلسل ارتقاء کرنے کا رجحان اس میں کہاں سے پیدا ہو گیا۔؟؟

پھر یہ توجیہ عین اپنی ساخت کے اعتبار سے دو خدا چاہتی ہے کیونکہ حرکت اول کی توجیہ کے لئے تو اتفاق کا نام لیا جاسکتا ہے مگر اس کے بعد کی مسلسل حرکت کو کسی حال میں بھی اتفاق نہیں کہا جاسکتا۔ اس کی توجیہ کے لئے دوسرا خدا تلاش کرنا پڑے گا۔

اس مشکل کو حل کرنے کیلئے اصول تعلیل پیش کیا جس کا مطلب یہ ہے کہ حرکت اول کے بعد کائنات میں علت اور معلول کا ایک ایسا سلسلہ قائم ہو گیا ہے کہ ایک کے بعد ایک تمام واقعات پیش آتے چلے جا رہے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے بچے بہت سی اینٹیں کھڑی کر کے کنارے کی ایک اینٹ گرا دیتے ہیں تو اس کے بعد کی تمام اینٹیں خود بخود گرتی چلی جاتی ہیں۔ جو واقعہ ظہور میں آتا ہے اس کا سبب کائنات کے باہر کہیں موجود نہیں ہے بلکہ ناقابل تسخیر قوانین کے تحت حالات ماقبل لازمی نتیجہ ہوتا ہے اور یہ سابقہ حالات بھی اپنے سے پہلے واقعات کا لازمی نتیجہ تھے۔ اس طرح کائنات میں علت اور معلول کا ایک لامتناہی سلسلہ قائم ہو گیا ہے۔ -

اس اصول کو قدرت کا اساسی قانون مقرر کرنا سترہویں صدی کا ایک بہت بڑا واقعہ تھا چنانچہ یہ تحریک شروع ہوئی کہ تمام کائنات کو ایک مشین ثابت کیا جائے انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں یہ تحریک اپنے پورے عروج پر آگئی۔ یہ زمانہ سائنس دان انجینئروں کا تھا جن کی دلی خواہش تھی کہ قدرت کے مشینی ماڈل بنائے جائیں اس زمانہ میں ہیلیم ہولٹز نے کہا تھا کہ ”تمام قدرتی سائنسوں کا آخری مقصد اپنے آپ کو میکینکس میں منتقل کر لینا ہے۔“

اگرچہ اس اصول کے مطابق کائنات کے تمام مظاہر کی تشریح کرنے میں ابھی سائنس دانوں کو کامیابی نہیں ہوئی تھی مگر ان کو یقین تھا کہ کائنات کی تشریح میکینکس پر قائم ہو سکتی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ تھوڑی سی کوشش کی ضرورت ہے اور بالآخر تمام عالم ایک مکمل چلتی ہوئی مشین ثابت ہو جائے گا۔

ان باتوں کا انسانی زندگی سے تعلق صاف ظاہر تھا۔ اصول تعلیل کی ہر توسیع اور قدرت کی ہر کامیاب میکینکس تشریح نے اختیار انسانی پر یقین کرنا محال بنا دیا کیونکہ اگر یہ اصول تمام قدرت پر حاوی ہے تو زندگی اس سے کیوں متشنی ہو سکتی ہے۔؟

آخر انیسویں صدی کے آخر ہی میں سائنس پر یہ واضح ہو گیا تھا کہ کائنات کے بہت سے مظاہر بالخصوص روشنی اور قوت کشش میکینکس تشریح کی ہر کوشش کو ناکام بنا دیتے ہیں۔ یہ بحث ابھی جاری تھی کہ کیا ایسی مشین بنائی جاسکتی ہے جو نیوٹن کے افکار باخ کے جذبات اور مائیکل انجلو کے خیالات کا اعادہ کر سکے۔ مگر سائنس دانوں کو بڑی تیزی سے یقین

ہوتا جا رہا تھا کہ شمع کی روشنی اور سیب کا گرنا کوئی مشین نہیں دہرا سکتی۔ قدیم سائنس نے بڑے وثوق کے ساتھ اعلان کیا تھا کہ قدرت صرف ایک ہی راستہ اختیار کر سکتی ہے جو اول روز سے علت اور معلول کی مسلسل کڑی کے مطابق ابد تک کے لئے معین ہو چکا ہے۔ مگر بالآخر سائنس کو خود یہ تسلیم کرنا پڑا کہ کائنات کا ماضی اس قدر اٹل طور پر اس

کے مستقبل کا سبب نہیں ہے جیسا کہ پہلے خیال کیا جاتا تھا۔ موجودہ معلومات کی روشنی میں سائنس دانوں کی ایک بڑی اکثریت کا اب اس بات پر اتفاق ہے کہ علم کا دریا ہمیں

ایک غیر میکاکی حقیقت کی طرف لئے جا رہا ہے۔ کائنات کی پیدائش اور اس کی حرکت کے بارے میں یہ دونوں نظریئے جو سائنسی ترقیوں کے ساتھ وجود میں آئے تھے اب تک یقین کی دولت سے محروم ہیں۔ جدید تحقیقات اس کی بنیاد کو مضبوط نہیں بناتی بلکہ اور کمزور کر دیتی ہیں اس طرح گویا سائنس خود اس نظریہ کی تردید کر رہی ہے اب انسان دوبارہ اسی منزل پر پہنچ گیا ہے جس کو چھوڑ کر اس نے اپنا سفر شروع کیا تھا۔

محدود! اتفاقات نہیں، قوانین اور سسٹمز

محدود! اتفاقات نہیں، قوانین اور سسٹمز! محدود! اتفاقات

حوادث کی تفسیر تو تم نے اپنی اٹکل سے جو کی سو کی، ”فزیکل“ لازمی physical laws کا ’سورس‘ بھی کبھی ڈھونڈا...؟ تمہاری اس مرتب منظم کائنات میں ’حوادث‘ کہاں... یہاں تو قدم قدم پر ”قوانین“ اور ”سسٹمز“ ہیں جو ’واقعات‘ کو اپنے آہنی شکنجے میں جکڑے ہوئے ”ہمیشہ“ ایک مخصوص

مطلوب جی... ہاں... قوانین میں جہت دھکتے ہیں!!!

”اتفاقات“ ہوتے تو ایک چیز کو ہوا میں چھوڑنے سے کبھی وہ نیچے کی طرف جاتی تو کبھی اوپر کی طرف! اور نظام!!!

مگر یہاں اس ”تفاوت“ (بے قاعدگی) اور ”حوادث“ کی گنجائش کہاں؟

تا تری خلق فی الرحمن من تفاوت

اول تا آخر... طے شدہ ٹریکس اور پیٹرنز (set patterns and tracks) ہیں؛ جو ایک حکمت اور قہر کے ساتھ ہر چیز کو اپنا پابند رکھے ہوئے ہیں!

یہاں محض ’واقعات‘ تھوڑی ہیں... باقاعدہ ”سسٹمز“ ہیں جو نہایت باریکی accuracy پر مبنی ”قواعد“ کی رُو سے ”واقعات“ کے پیچھے کام کرتے ہیں!

کچھ تفسیر ان منضبط accurate قواعد کی بھی تو ہو... کہیں کہاں سے وارد ہوئے!!!

مقررہ خدائی ”سنتیں“ جو ہر بار ایک ہی ڈھب سے اور باقاعدہ ریاضی پیمائشوں mathematical measurements کے ساتھ اپنا آپ دہراتی ہیں،

اور پوری کائنات کو مسلسل اپنی جکڑ میں لے کر... اور واقعات در واقعات احوال کو جنم دے کر... کسی علم اور حکمت پر مبنی ”ارادہ“ و ”منصوبہ“ کی منہ بولتی زبان ہیں!!!

پھر ان سنتوں (قوانین) میں ایسا حیرت انگیز ربط inter-relation... اس قدر ہم آہنگی co-ordination، نتیجہ

خیزی productivity، معنویت meaningfulness اور کونسٹنسی consistency جو ہر نظر کو خیرہ کر دے!!!

تمام کلاسز کی حل شدہ مشقیں ہماری ویب سائٹ 23 DIGITALSPOT.PK سے FREE میں ڈاؤن لوڈ کریں

پر رابطہ کریں +923065772734

پر رابطہ کریں +923065772734

حوادث میں گم ہو گئے۔۔۔۔۔
ان "توانین" کا "سورس" بھی کبھی تلاش کیا؟؟؟

جب یہ لگے بندھے اور ڈیزائن شدہ laws, systems, tracks and patterns ہیں... تو 'حوادث' کہاں رہے!!؟

خدا کے بندو۔۔ اس تسبیح کرتی کائنات میں نظریہ اُٹکل کی گنجائش ہے؟؟؟!

الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ آفتاب اور ماہتاب (مقررہ) حساب سے ہیں۔

وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ تارے اور درخت سب اسی کا سجدہ کر رہے ہیں۔

وَالسَّمَاءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ الْمِيزَانِ۔ آسمان کو اُسی نے بلند کیا اور باقاعدہ میزان قائم کر دی۔

أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ تاکہ خود تم بھی میزان میں زیادتی نہ کرو۔

وَأَقِيمُوا الزُّن وَالْقِسْطِ وَلَا تَحْسَبُوا الْمِيزَانَ اور انصاف سے تولو اور تول نہ گھٹاؤ۔

وَالْأَرْضَ وَضَعَهَا لِلْأَنَامِ فِيهَا فَالْكِهَّةُ وَالنَّحْلُ ذَاتُ الْأَكْمَامِ اور اسی نے خلقت کے لئے زمین کا پھونا کیا۔ جسمیں (ہر طرح کے) میوے ہیں اور کھجور کے غلافوں والے درخت۔

وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ اور بھس کے ساتھ اناج اور خوشبو کے پھول۔

فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ پس اے جن و انس، تم اپنے رب کے کن کن عجائب قدرت کو جھٹلاؤ گے؟

اپنی ان "نظریہ اُٹکل" تفسیرات میں

ایک علیم، حکیم، قادر و مقتدر "خدا" سے بھاگ کر کہاں جاؤ گے۔۔۔۔۔؟

سائنس ہماری کیوں کا جواب نہیں دیتی

سائنس جب کبھی اس کا جواب دیتی ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے، اس سے درحقیقت یہ مراد ہوتی ہے کہ ایسا کیسے ہوتا ہے۔ اسباب کی سائنسی تحقیق ہمیشہ کسی امر کی تجربہ گاہ میں

تصدیق و تکرار سے بحث کرتی، تخلیق کی غیبی و روحانی وجوہات سے اسکو کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوتی۔

جب انسان اپنے گرد و نواح پر نظر ڈالتا ہے تو اس کا یہ سوال، ایسا کیوں ہے، عموماً اس جواب کا متقاضی ہوتا ہے کہ اس کارخانہ ہستی کی اصل کیا ہے، تخلیق کا مبتدا و منتہی کیا ہے،

مقصد زندگانی کیا ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے بارے میں سائنسی تحقیق یا تو خاموش ہے یا اس کا خیال ہے کہ یہ سب یونہی بے کار بے سبب بے وجہ وجود میں آگیا ہے۔

آپ مجھ سے سوال پوچھیں کہ سامنے کھڑی گاڑی کس نے بنائی؟ اور میں آپ کو جواب دوں کہ دراصل پہلے انجن بنا پھر اس پر گاڑی کی باڈی سجائی گئی اور پھر اس میں پیہیے شیشے

لگا کر اسکی تزئین کی گئی۔ اس جواب پر ممکن ہے آپ مجھیں ناگواری سے گھوریں ضرور، کہ بھائی سیدھا سا سوال تھا کہ گاڑی کس نے بنائی، جواب دے دینا تھا کہ ٹویوٹا نے۔۔ بات سمجھ آ جاتی۔ یہ اتنی لمبی اور غیر متعلق تفصیل بتانے کی کیا ضرورت تھی؟ کہ گاڑی، کیسے، بنی؟ یا اس میں کیا کیا اجزاء استعمال ہوئے؟ یہ تو سوال ہی نہ تھا۔ لہذا پوچھنے والا جواب سے محروم ہی رہے گا۔

آپ مجھ سے دریافت کریں کہ تاج محل کس نے تعمیر کیا؟ اور میں پروفیسر انداز میں یہ جواب دینے لگوں کہ اسکی تعمیر میں پہلے اینٹیں لگائی گئیں، پھر کھڑکیاں دروازے بنے، پھر رنگ و روغن ہوا اور آخر میں باہر کا چبوتر ا بنایا گیا۔ یقیناً آپ کو میرے اس احمقانہ جواب پر شدید کوفت ہوگی۔ آپ نے تو آسان سا سوال پوچھا تھا کہ تاج محل کس نے بنوایا بنایا؟ میرا جواب ہونا چاہیے تھا کہ مغل بادشاہ شاہ جہاں نے اپنے کاریگروں سے اسے تعمیر کروایا تھا۔ بات مکمل ہو جاتی۔ اس تقریر کی قطعی کوئی حاجت نہ تھی کہ اسکی تعمیر میں کون سا کام پہلے اور کون سا بعد میں ہوا؟ اس نامناسب تفصیل سے یہی ہوا کہ سوال جوں کا توں باقی رہا۔ ملحدین کا حال بھی کچھ اس سے زیادہ بہتر نہیں ہے۔ آپ ان سے پوچھیں کہ اس باشعور انسان کو کس نے تخلیق کیا؟ یہ فوراً ارتقاء سمیت دس نظریات پیش کر دیں گے کہ تخلیق کا عمل کن مراحل سے گزرا۔ انہیں کوئی عقل دلائے کہ عقلمندوں! انسان کی تخلیق کے مراحل جو بھی رہے ہوں، سوال یہ نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ تخلیق، کس نے کی؟ آپ ان سے دریافت کریں کہ اس عظیم کائنات کو ایسے بہترین نظم کے ساتھ کس نے پیدا کیا؟ اور یہ جواب میں آپ کو بگ بینگ سمیت پچاس سائنسی تھیوریاں پیش کرنے لگیں گے کہ کائنات کی تخلیق میں کون کون سے مراحل گزرے ہیں؟ انہیں کوئی سمجھائے کہ زمین فلسفیوں سوال یہ نہیں ہے۔ تخلیق کائنات میں کتنا ہی وقت لگا ہوا یا کتنے ہے مراحل گزرے ہوں۔ سوال یہ ہے کہ کون ہے جس نے بے جان بے شعور مادہ سے اس پر ہیبت کائنات کو تخلیق کر دیا۔ اسمیں بے مثال نظم اور بے نظیر توازن پیدا کر دیا؟

ہم	پوچھ	رہے	ہیں	کہ	کس نے	بنایا	..؟؟
آپ	فرما	رہے	ہیں	کہ	کیسے	بنا	..؟؟
سوال	ہمارا	گندم	ہے	.. جواب	آپ	کا	چنا ہے..

یہ جان لیجیے کہ سائنسدانوں اور دیگر ہر شعبہ کے ماہر کی عزت اپنی جگہ ضروری ہے مگر ہر فن اور علم کی اپنی حدود متعین ہیں۔ کوئی انسانی علم اپنی حدود سے تجاوز نہیں کر سکتا۔ سائنس مادی علوم سے آگے نہیں دیکھ سکتی۔ مادہ کہاں سے وجود میں آیا؟ یا توانائی کون تخلیق کر گیا؟ یا ایک بے جان مادہ کے ڈھیر سے جیتا جاگتا باشعور انسان کون نکال لایا؟ یہ اور ایسے بی شمار سوالوں کے سامنے مادی علوم کے پر جلنے لگتے ہیں۔ سائنس کا کام ہے یہ بتانا کہ کوئی مخلوق، کیسے، تخلیق ہوئی؟ مگر کیوں، ہوئی اور کس نے اسے تخلیق کیا؟ یہ سوالات اس کی حدود سے باہر ہیں۔ اس کے لئے لامحالہ وحی کی جانب ہی دیکھنا ہوگا۔

کیوں اور لادینیت کی بے بسی

اللہ	کو	ماننا	ایک	ڈسپلن	کو	قبول	کرنا	ہوتا	ہے۔
اگر	کوئی	نہ	ماننا	چاہے	تو	نہ	مانے۔۔۔	مگر،	
جو	خدا	کو	نہیں	مانتا	وہ	یہ	بتادے	کہ:	
کائنات				کیوں				بنی؟	
زندگی			کا	ظہور		کیوں		ہوا؟	
زندگی	لاکھوں	کروڑوں	شکلیں	بدل	کر	انسان	کے	روپ	میں
ارتقاء	کے	عمل	میں	ابتدائی	اور	پچھلے	آثارِ زندگی	کیوں	معدوم
حشرات			الارض	2020		معدوم	کیوں	نہیں	ہوئے؟
شعور			کیا		اور	کیوں		ہے؟	
اچھائی			اور	برائی	ہیں	ہی		کیوں؟	
زندگی	باہر	کے	ماحول	کی	محتاج	کیوں	ہے،	خود	روزِ زندگی
کیوں	درخت	زندہ	رہنے	کے	لینے	آکسیجن	نہیں	لیتے؟	
کیوں	رات	اور	دن	ایک	نظام	کے	تحت	آتے	اور
کیوں	سب	انسان	تمام	رنگ	ایک	سا	دیکھتے	ہیں؟	
کیوں	ہر	پھل	اور	سبزی	اپنا	بیج	لیکر	پیدا	ہوتے
کیوں	سب	انسانوں	کا	خون	سرخ	ہوتا	ہے؟		
کیوں	خون	کے	گروپ	ہوتے	ہیں؟				
کیوں	ہر	انسان	کا	دل	ایک	ہی	طرح	دھڑکتا	ہے؟
کیوں	ہر	انسان	کا	دماغ	بھی	ایک	جیسا	ہوتا	ہے؟
کیوں	ہر	انسان	جین	میں	وراثت	لیکر	پیدا	ہوتا	ہے؟

جذبات کیوں انسان اور حیوان کی مادہ میں ممتا کا جذبہ موجزن ہوتا ہے؟
کیوں انسان اور ہر جاندار کے جوڑے کیوں ہوتے ہیں اور ان میں آپس میں کشش کیوں ہوتی ہے؟

یہ ہزاروں سوالات میں سے چند ہیں، جن کے جوابات کے لیے ایک منکر خدا مجبور ہے کہ سائنس کا سہارا لے۔
کیونکہ سائنس ہی ہمارے اطراف موجود عظیم تر سائنس کی تشریح کرتی ہے،
لیکن سب جان لیں کہ سائنس صرف 'کیا' یعنی واٹ اور 'کیسے' یعنی ہاؤ کا جواب دے سکتی ہے مگر کیوں کا حتمی جواب نہیں۔۔۔۔
اسکی وجہ یہ ہے کہ ہر کیوں کے جواب کے اندر مزید کیوں بھی چھپے ہوتے ہیں۔

گویا سائنس کے پاس 'کیوں' کے جوابات نہیں ہوتے بلکہ کیا اور 'کیسے' کے ہوتے ہیں!۔
لیکن متجسس ذہن صرف کیا اور کیسے کا ہی نہیں بلکہ کیوں کے جواب کا بھی متلاشی ہوتا ہے،
اب سوال یہ ہے کہ کیا ہم سائنس پر انحصار کر کے ہر 'کیوں' سے کنارہ کش ہو جائیں؟
تو ادھورے جوابات، مغالطوں، وسوسوں اور شک کی بنیاد پر اندھی زندگی گزارنی ہے تو سائنس کو رہبر بنائیں ورنہ اپنی عقل استعمال کریں۔

کیا ہم اپنی زندگیوں سے 'کیوں' کو خارج کر سکتے ہیں؟ نہیں!
پھر آخر کیوں کا جواب کس کے پاس ہے؟
اسلام ایمان بالغیب کی تعلیم دیتا ہی اسی لیے ہے کہ انسان کو ہر طرح سے مطمئن کیا جائے۔
انسان کے اطراف موجود سپر سائنس ایک خالق کی تخلیق ہے اور ہر 'کیوں' کا جواب اس سپر سائنس کے خالق کے پاس ہے۔۔۔۔

وہ خالق --- جو حواس سے تو اوجھل مگر شعور میں جگمگاتا ہے۔
جو اللہ ہے۔۔۔۔

اور لادینیت کے پرچارک دوستوں!
اور اگر خدا نہیں ہے تو پھر خالق کا متبادل بتلا دیں! بے شک آپ سائنس کا سہارا بھی لے لیں۔۔

اور اگر آپ نہ بتا سکیں تو یہ خیال رہے کہ اس میں پیچ کی کوئی راہ ہے نہیں۔ یا تو خالق کو قبول کرو یا دلیل سے مسترد کرو۔ اور یہ بھی واضح رہے کہ۔۔ اللہ کو خالق قبول کرنا۔۔ پورا پیچ لینا ہوتا ہے، ادھورا نہیں۔ لو تو پورا۔۔۔ پیچ۔۔۔ ورنہ ادھورے میں نقصان ہی نقصان۔۔۔۔

سیکولر ازم، لبرل ازم، سوشلزم اور روشن خیالی وغیرہ۔۔ یہ سب ادھورے پیچ ہیں جن کی نظریاتی بنیادیں ہیں ہی نہیں۔

اگر تخلیق کے حوالے سے سائنس، لبرلز اور سیکولرز کے پاس پختہ نظریات ہیں تو سامنے لائیے۔

ورنہ سادہ لوح مسلمانوں اور کم علم نوجوانوں کو ورغلائیں نہیں۔

روشن خیالی کے نام پر دین کو مسخ نہ کریں اور نہ اپنی خواہشات کا غلام بنائیں۔

اللہ کے دین میں پورا کا پورا داخل ہو نے کی کوشش کریں۔۔۔

اگر نہ کر سکیں تو اپنی اس کمزوری کا انتقام اسلام سے نہ لیں۔ اسکا حلیہ نہ بدلیں اپنے آپ کو بدلیں۔

اپنی خواہشات کو خدا کے دین کا نام نہیں دیں۔ قرآن کے احکامات کہ متنازعہ نہ بنائیں۔

کچھ کہنے اور لکھنے سے پہلے سوچیں کہ اللہ کیا چاہتا ہے، اسکی خواہش جاننے کا ذریعہ یا واسطے کیا ہیں۔

ان واسطوں کو تلاش کیجئے۔

بے دین ہونے سے بچیں کیونکہ جو نظریہ اللہ کو نظر انداز کرے وہی لادینیت کا ٹھکانہ ہے۔

قوانین فطرت اور خدا کی ضرورت

مذہب کی مخالفت میں کئی استدلال اس بات کے ثبوت کے لئے پیش کئے جاتے ہیں اور انکی بنیاد پر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ دور جدید نے مذہب کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں

رکھی ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ محض ایک بے بنیاد دعویٰ ہے، جدید طریق فکر نے مذہب کو کسی بھی درجہ میں کوئی نقصان نہیں پہنچایا ہے، یہاں مذہب کے خلاف مقدمے

میں پیش کیے گئے دلائل پر ایک عمومی تبصرہ پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے اس دلیل کو لیتے ہیں جو طبعیاتی تحقیق کے حوالے سے پیش کی گئی ہے یعنی کائنات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوا کہ یہاں جو واقعات ہو رہے ہیں

وہ ایک متعین قانون فطرت کے مطابق ہو رہے ہیں اس لئے ان کی توجیہ کرنے کیلئے کسی نامعلوم خدا کا وجود فرض کرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ معلوم قوانین خود اس کی

توجیہ کیلئے موجود ہیں اس استدلال کا بہترین جواب وہ ہے جو ایک عیسائی عالم نے دیا ہے اس نے کہا ہے۔

“Nature is the fact not an explanation”

یعنی فطرت کا قانون کائنات کا ایک واقعہ ہے وہ کائنات کی توجیہ نہیں ہے تمہارا یہ کہنا صحیح ہے کہ ہم نے فطرت کے قوانین معلوم کر لئے ہیں مگر تم نے جو چیز معلوم کی ہے وہ اس مسئلے کا جواب نہیں ہے جس کے جواب کے طور پر مذہب وجود میں آیا ہے مذہب یہ بتاتا ہے کہ وہ اصل اسباب و محرکات کیا ہیں جو کائنات کے پیچھے کام کر رہے ہیں جب کہ تمہاری دریافت صرف اس مسئلہ سے متعلق ہے کہ کائنات جو ہمارے سامنے کھڑی نظر آتی ہے اس کا ظاہری ڈھانچہ کیا ہے۔ جدید علم جو کچھ ہمیں بتاتا ہے وہ صرف واقعات کی مزید تفصیل ہے نہ کہ اصل واقعہ کی توجیہ سائنس کا سارا علم اس سے متعلق ہے کہ جو کچھ ہے وہ کیا ہے؟ یہ بات اس کی دسترس سے باہر ہے کہ جو کچھ ہے وہ کیوں ہے؟ جب کہ توجیہ کا تعلق اسی دوسرے پہلو سے ہے۔

اس کو ایک مثال سے سمجھئے مرغی کا بچہ انڈے کے مضبوط خول کے اندر پرورش پاتا ہے اور اس کے ٹوٹنے سے باہر آتا ہے یہ واقعہ کیوں کر ہوتا ہے کہ خول ٹوٹے اور بچہ جو گوشت کے لو تھڑے سے زیادہ نہیں ہوتا وہ باہر نکل آئے پہلے کا انسان اس کا جواب یہ دیتا تھا کہ خدا ایسا کرتا ہے مگر اب خورد بینی مشاہدہ کے بعد معلوم ہوا کہ جب ۲۱ روز کی مدت پوری ہونے والی ہوتی ہے اس وقت ننھے بچے کی چونچ پر ایک نہایت چھوٹی سی سخت سینک ظاہر ہوتی ہے اس کی مدد سے وہ اپنے خول کو توڑ کر باہر آجاتا ہے سینک اپنا کام

پورا کر کے بچہ کی پیدائش کے چند دن بعد خود بخود چھڑ جاتی ہے۔ مخالفین مذہب کے نظریے کے مطابق یہ مشاہدہ اس پرانے خیال کو غلط ثابت کر دیتا ہے کہ بہ کو باہر نکالنے والا خدا ہے کیونکہ خورد بین کی آنکھ ہم کو صاف طور پر دکھا رہی ہے کہ ایک ۲۱ روزہ قانون ہے جس کے تحت وہ صورتیں پیدا ہوتی ہیں جو بچہ کو خول کے باہر لاتی ہیں یہ مغالطہ کے سوا اور کچھ نہیں جدید مشاہدہ نے جو کچھ ہمیں بتایا ہے وہ صرف

واقعہ کی چند مزید کڑیاں ہیں اس نے واقعہ کا اصل سبب نہیں بتایا اس مشاہدہ کے بعد صورت حال میں جو فرق ہوا ہے وہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ پہلے جو سوال خول کے ٹوٹنے کے بارے میں تھا وہ سینک کے اوپر جا کر ٹھہر گیا بچہ کا اپنی سینک سے خول کو توڑنا واقعہ کی صرف ایک درمیانی کڑی ہے وہ واقعہ کا سبب نہیں ہے واقعہ کا سبب تو اس وقت معلوم ہو گا جب ہم جان لیں کہ بچہ کی چونچ پر سینک کیسے ظاہر ہوئی دوسرے لفظوں میں اس آخری سبب کا پتہ لگائیں جو بچہ کی اس ضرورت سے واقف تھا کہ اس کو خول سے باہر نکلنے کیلئے کسی سخت مددگار کی ضرورت ہے اور اس نے مادہ کو مجبور کیا کہ عین وقت پر ٹھیک ۲۱ روز بعد وہ بچہ کی چونچ پر ایک ایسی سینک کی شکل میں نمودار ہو جو اپنا کام پورا

کرنے کے بعد چھڑ جائے۔ گویا پہلے یہ سوال تھا کہ خول کیسے ٹوٹتا ہے اور اب سوال یہ ہو گیا کہ ”سینک کیسے بنتی ہے“ ظاہر ہے کہ دونوں حالتوں میں کوئی نوعی فرق نہیں اس کو زیادہ سے زیادہ حقیقت کا وسیع تر مشاہدہ کہہ سکتے ہیں حقیقت کی توجیہ کا نام نہیں دے سکتے۔

یہاں میں ایک امریکی عالم حیاتیات ”سیسل بوائے حامان“ کے الفاظ نقل کروں گا ”غذا ہضم ہونے اور اس کے جزو بدن بننے کے حیرت انگیز عمل کو پہلے خدا کی طرف منسوب کیا جاتا تھا اب جدید مشاہدہ میں ہو کیمیائی رد عمل کا نتیجہ نظر آتا ہے مگر کیا اس کی

وجہ سے خدا کے وجود کی نفی ہو گئی آخر وہ کون طاقت ہے جس نے کیمیائی اجزا کو پابند کیا کہ وہ اس قسم کا مفید رد عمل ظاہر کریں غذا انسان کے جسم میں داخل ہونے کے بعد ایک عجیب و غریب خود کار انتظام کے تحت جس طرح مختلف مراحل سے گزرتی ہے اس کو دیکھنے کے بعد یہ بات بالکل خارج از بحث معلوم ہوتی ہے کہ یہ حیرت انگیز انتظام محض اتفاق سے وجود میں آگیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مشاہدہ کے بعد تو اور زیادہ ضروری ہو گیا ہے کہ ہم یہ مانیں کہ خدا اپنے ان عظیم قوانین کے ذریعہ عمل کرتا ہے جس کے

تحت اس نے زندگی کو وجود دیا ہے۔“ The evidence of God in Expanding Universe p221

قوانین فطرت کی توجیہ کا مسئلہ

یہ صحیح ہے کہ سائنس نے کائنات کے بارے میں انسان کے مشاہدے کو بہت بڑھا دیا ہے اس نے دکھا دیا ہے کہ وہ کون سے فطری قوانین ہیں جن میں یہ کائنات جکڑی ہوئی ہے اور جس کے تحت وہ حرکت کر رہی ہے مثلاً پہلے آدمی صرف یہ جانتا تھا کہ پانی برستا ہے مگر اب سمندر کی بھاپ اٹھنے سے لے کر بارش کے قطرے زمین پر گرنے تک کا وہ پورا عمل انسان کو معلوم ہو گیا ہے۔ جس کے مطابق بارش کا واقعہ ہوتا ہے مگر یہ ساری دریافتیں صرف واقعہ کی تصویر ہیں وہ واقعہ کی توجیہ نہیں ہیں سائنس یہ نہیں بتاتی کہ فطرت کے قوانین کیسے قوانین بن گئے وہ کیسے اس قدر مفید شکل میں مسلسل طور پر زمین و آسمان میں قائم ہیں اور اس صحت کے ساتھ قائم ہیں کہ ان کی بنیاد پر سائنس میں قوانین مرتب کئے جاتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ وہ فطرت جس کو معلوم کر لینے کی وجہ سے انسان یہ دعویٰ کرنے لگا ہے کہ اس نے کائنات کی توجیہ دریافت کر لی وہ محض دھوکا ہے یہ ایک غیر متعلق بات کو سوال کا جواب بنا کر پیش کرنا ہے یہ درمیانی کڑی کو آخری کڑی قرار دینا ہے یہاں پھر میں مذکورہ عالم کے الفاظ دہراؤں گا۔

Nature does not explain, she her self is in need of an explanation

یعنی فطرت کائنات کی توجیہ نہیں کرتی وہ خود اپنے لئے ایک توجیہ کی طالب ہے۔

اگر آپ کسی ڈاکٹر سے پوچھیں کہ خود سرخ کیوں ہوتا ہے تو وہ جواب دے گا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ خون میں نہایت چھوٹے موٹے سرخ اجزا ہوتے ہیں (ایک انچ کے سات ہزارویں حصے کے برابر) یہی سرخ ذرات خون کو سرخ کرنے کا سبب ہیں۔

”درست مگر یہ ذرات سرخ کیوں ہوتے ہیں“

”ان ذرات میں ایک خاص مادہ ہوتا ہے جس کا نام ہیمو گلوبن ہے یہ مادہ جب پھیپھڑے میں آکسیجن جذب کرتا ہ تو گہرا سرخ ہو جاتا ہے۔“

”ٹھیک ہے مگر ہیمو گلوبن کے حام سرخ ذرات کہاں سے آئے ہیں“

”وہ آپ کی تلی میں بن کر تیار ہوتے ہیں“

”ڈاکٹر صاحب! جو کچھ آپ نے فرمایا وہ بہت عجیب ہے مگر مجھے بتائیے کہ ایسا کیوں ہے کہ خون سرخ ذرات تلی اور دوسری ہزاروں چیزیں اس طرح ایک کل کے اندر باہم

مربوط ہیں اور اس قدر صحت کے ساتھ اپنا اپنا عمل کر رہی ہیں“
”یہ قدرت کا قانون ہے“

”وہ کیا چیز ہے جس کو آپ قدرت کا قانون قدرت کہتے ہیں“
اس مراد

Blind interplay of physical and chemical forces

طبعی اور کیمیائی طاقتوں کا اندھا عمل ہے۔

مگر کیا وجہ ہے کہ یہ اندھی طاقتیں ہمیشہ ایسی سمت میں عمل کرتی ہیں جو انہیں متعین انجام کی طرف لے جائے؟ کیسے وہ اپنی سرگرمیوں کو اس طرح منظم کرتی ہیں کہ ایک چڑیا اڑنے کے قابل ہو سکے، ایک مچھلی تیر سکے ایک انسان اپنی مخصوص صلاحیتوں کے ساتھ وجود میں آئے۔؟

میرے دوست مجھ سے یہ نہ پوچھو سائنس داں صرف یہ بتا سکتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ کیا ہے؟ اس کے پاس اس سوال کا جواب نہیں ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ کیوں ہو رہا ہے۔؟

یہ سوال وجوہ واضح کر رہا ہے کہ سائنسی دریافتوں کی حقیقت کیا ہے بلاشبہ سائنس نے ہم کو بہت سی نئی نئی باتیں بتائی ہیں مگر مذہب جس سوال کا جواب ہے اس کا ان دریافتوں سے کوئی تعلق نہیں اس قسم کی دریافتیں اگر موجودہ مقدار کے مقابلے میں اربوں کھربوں گنا بڑھ جائیں تب بھی مذہب کی ضرورت باقی رہے گی کیوں کہ یہ

دریافتیں صرف ہونے والے واقعات کو بتاتی ہیں یہ واقعات کیوں ہو رہے ہیں اور ان کا آخری سبب کیا ہے اور اس کا جواب ان دریافتوں کے اندر نہیں ہے یہ تمام کی تمام

دریافتیں صرف درمیانی تشریح ہیں جبکہ مذہب کی جگہ لینے کے لئے ضروری ہے کہ وہ آخری اور کلی تشریح دریافت کر لے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ کسی مشین کے اوپر ڈھکن

لگا ہوا ہو تو ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ وہ چل رہی ہے اگر ڈھکن اتار دیا جائے تو ہم دیکھیں گے کہ باہر کا چکر کس طرح ایک اور چکر سے چل رہا ہے اور وہ چکر کسی دوسرے بہت

سے پرزوں سے کر حرکت کرتا ہے۔ یہاں تک کہ ہو سکتا ہے کہ ہم اس کے سارے پرزوں اور اس کی پوری حرکت کو دیکھ لیں مگر کیا اس علم کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے مشین

کے خالق اور اس کے سبب حرکت کاراز بھی معلوم کر لیا کیا کسی مشین کی کارکردگی کو جان لینے سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ وہ خود بخود بن گئی ہے اور اپنے آپ چلی جا رہی ہے

اگر ایسا نہیں ہے تو کائنات کی کارکردگی کی بعض جھلکیاں دیکھنے سے یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ یہ سارا کارخانہ اپنے آپ قائم ہوا اور اپنے آپ چلا جا رہا ہے ہیریز نے یہی بات کہی تھی

جب اس نے ڈارو نزم پر تنقید کرتے ہوئے کہا۔

“nature selection may explain the survival of fittest, but cannot explain the arrival of the fittest”

مسئلہ جبر و قدر پر مولانا مودودی کی کتاب پڑھنے سے بندے کے اپنے افعال میں مجبور محض اور بالکل آزاد ہونے کے حوالے سے مختلف گروہوں کے مذہب اور استدلال کا علم ہوتا ہے، وہاں آدمی یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ قرآن کو اس نظر سے دیکھنے والوں نے پورے قرآن کو جبر و قدر کی کتاب بنا دیا۔ بہت سی آیات سے اپنے مذہب کے حق میں استدلال کیا گیا اور کتنی آیات ہیں جن کا جواب دیا گیا اور ان میں تاویلی منہج کو اپنایا گیا۔ ایسے لگنے لگتا ہے کہ قرآن تو بس جبر و قدر کے مسئلہ پر مشتمل کتاب ہے۔ قرآنیات کے طالب علم کے لئے اس کتاب کا مطالعہ اس لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے کہ گروہی کشمکش میں قرآن سے مختلف گروہوں نے کس طرح کے استدلال کیے اور ان کے استدلال کی قوت و ضعف کو بھی دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ جبر و قدر کے دونوں مذاہب نے قرآن سے استدلال کر کے آیات میں جو تعارض و تناقض ثابت کر دیا ہے وہ بھی حل کا متقاضی ہے۔ اس کی ایک کوشش مولانا مودودی بھی کرتے ہیں، اس کوشش میں یہ سب کو جمع کر دیتے ہیں۔

سائنسدانوں اور فلاسفہ میں جبر و قدر کے حوالے سے کیا نظریات پائے جاتے ہیں اور پھر اس کے بعد مسلم فلاسفہ و متکلمین کی رجحانات رکھتے ہیں ان سب کو بیان کرتے ہیں، بعض جگہ حاشیہ میں مولانا نے عیسائی متکلمین کا بھی ذکر کیا ہے کہ وہ جبر و قدر کی کڑیوں کو کس طرح ملاتے اور حل کرتے ہیں۔ مولانا مودودی کی نظر میں درحقیقت دو ہی گروہ ہیں جبریہ اور قدریہ۔ درمیان والے جس قدر بھی گروہ ہیں ان کو بعض سوالوں کے جواب میں کسی ایک جہت کو اپنانا ہی پڑتا ہے۔ امام ابو الحسن اشعری نے بندے کا اختیار ثابت کرنے کے لئے خلق کے ساتھ کسب کو تسلیم کیا، کہ چیزوں کی پیدائش تو اللہ پاک کی طرف سے ہوتی ہے لیکن اس کو کرتا بندہ ہی ہے لیکن یہ قدرت محض ایک آلہ ہے ارادہ الہی کے فعل میں آنے کا، درحقیقت خود اس قدرت میں کوئی تاثیر نہیں جو فعل کے وجود میں آنے کی علت ہو اور یہ آلہ کبھی خلق کے مخالف نہیں ہو سکتا۔ اشاعرہ اور ان کے ہم خیال حضرات خواہ کسب کے قائل ہوں یا نہ ہوں اور قدرت حادثہ کے لئے کسی قسم کی تاثیر مانتے ہوں یا نہ مانتے ہوں۔ ان کے استدلال کا منطقی نتیجہ خالص جبر ہی ہے۔ کیونکہ بندہ کے کسب میں خلق کے خلاف کرنے کی قدرت ہوگی یا نہیں؟ جبر کے مقدمات کو تسلیم کر کے بچ کی راہ نہیں اختیار کی جاسکتی۔ مسیحی متکلمین میں سے سینٹ آگسٹائن، سکوٹس اور دیگر نے بھی جبریت خالصہ سے بچنے کی کوشش کی ہے لیکن ان کی کوششیں بھی اس معاملے میں رائیگاں ہیں۔ ڈانس اسکوٹس نے صرف معتزلہ کی طرح قدرت کا مذہب اختیار کیا ہے۔

مولانا مودودی کی اپروچ اہل الحدیث والی ہے، جیسا کہ احادیث میں زیادہ غور و خوض اور تقدیر کے معاملات میں پڑنے سے منع کیا گیا۔ مولانا اس سلسلے میں متعدد احادیث نقل کرتے ہیں جن میں تقدیر اور ایسے معاملات میں علم کو خدا کے حوالے کرنے کا حکم دیا گیا یا ان میں مزید الجھنے سے سختی سے منع کر دیا گیا۔ مولانا اس مسئلہ میں اجمال میں رہنے کے قائل ہیں تفصیل میں نہ جایا جائے۔ مولانا انسانی عقل کی محدود بساط کو دلیل بناتے ہیں۔ محدود قوائے ذہنی سے غیر محدود چیزوں کی وسعتوں کو نہیں پایا جاسکتا۔ مولانا مودودی اس وسعت اور انسانی ذہن کی تنگ دامنی کو بھی نصوص سے استدلال کرتے ہیں۔

مسئلہ جبر و قدر کے جس قدر اشارات قرآن کریم میں وارد ہوئے ہیں وہ انسان میں قناعت، توکل، صبر و استقامت اور دنیوی طاقتوں سے بے خونی پیدا کرنے کے لئے ہے۔ غرض ان کا دینی مقصد ہے۔ حدیث میں آتا ہے ایک عورت اپنی بہن کے لئے طلاق کا سوال نہ کرے کہ اس کے حصے کا فائدہ اٹھا سکے۔ اس کے لئے تو وہی ہے جو اس کے لئے مقدر کر دیا گیا ہے۔ اب اس میں تقدیر کا تذکرہ ایک خاص مقصد کے لئے ہے اور وہ مقصد اخلاقی ہے۔ عزل کے مسئلہ پر اللہ کے نبی نے فرمایا جس کا پیدا ہونا طے ہے وہ تو پیدا ہوگا۔ غرض ایسی آیات و احادیث سے اخلاقی و عملی فوائد مطلوب تھے۔

ایک چیز کی مختلف علتیں ہو سکتی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کی طرف منسوب کیا جاسکتا ہے لیکن اس کی تفصیلات ہمارے علم میں نہیں کہ کس علت کا کس قدر حصہ ہے۔ خواہش اور اقدام فعل کے درمیان کس قدر قوتیں کام کرتی ہیں ظاہری و باطنی طور پر میں ان کو نہیں جانتا اور نہ جان سکتا ہوں۔ میرا وجد ان کہتا ہے کہ میرے ارادے و اختیار کا بھی کہیں دخل ہوتا ہے اس لئے اس کی نفی نہیں کی جاسکتی۔

ہر انسانی فعل کو خدا، انسان، شیطان، یا خدا اور انسان دو یا تین علتوں کی طرف منسوب ہے لیکن ان کی تاثیر کی مقدار ہم نہیں جانتے۔ ہر انسان میں یہ تاثیر جدا ہے کیونکہ انسانی طبیعتیں ملکوتی و شیطانی اعمال کی طرف راغب ہونے کے اعتبار سے مختلف قسم کی ہیں۔ قرآن کریم کی آیات میں مختلف طرف جو نسبت کی گئی ہے مولانا مودودی سب کو جمع کر دیتے ہیں۔

مولانا مودودی نے یہ مقدمہ قائم کیا تھا کہ جبر و اختیار کے بیچ کا کوئی مذہب نہیں اصل میں یہ دو ہی ہیں لیکن خود ان کے بیچ کی راہ اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور جبر و قدر میں تاویلی راہ اپناتے ہیں۔ مولانا مودودی جبر و قدر دونوں کی آیات کو ملا کر جبر و قدر ملا ایک مذہب بنانے کی کوشش کرتے ہیں جس میں خدا کا اختیار بھی رہتا ہے اور بندے کا بھی۔ لیکن غور سے دیکھنے پر اس پر بھی وہی اعتراضات ہوتے ہیں جو خود مولانا ایسے مذاہب پر کر چکے ہیں جنہوں نے بیچ کی راہ اختیار کرنا چاہی۔ مولانا کہتے ہیں کہ انسان کو محدود پیمانے پر آزادی دی گئی ہے یہ ودیعت کردہ ہے، انسان خود آزاد نہیں ہے لیکن کتنی ہے اس کا تعین نہیں کیا جاسکتا۔

مولانا اس مسئلے کو ایک اور اعتبار سے بھی تقسیم کرتے ہیں مسئلہ جبر و قدر کی اخلاقی اور طبعی گتھیاں تو سلجھ سکتی ہیں لیکن اس کے مابعد الطبیعی مسائل کی گتھیاں نہیں سلجھ سکتی۔ لیکن طبعی اور مابعد الطبعی کا تعین بھی اس باب میں خاصہ مشکل ہوتا ہے